سلسلہ آصفیہ نمبر (۲)

مراثی انیس

جلد اوّل

یعنی

جناب میر ببر علی صاحب انیس لکھنوی مرحوم و مغفور کے زمانہ پیری کا کلام

مُرتّبہ

مولانا سید علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ وظیفہ خوار

و پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن

مع مقدمہ

مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

۵۰۰ جلد سنہ ۱۹۳۵ء بار دوم

میر ببرعلي انیس لکھنوي

ولادت سنہ ۱۸۰۵ء ✿ وفات سنہ ۱۸۷۴ء

فہرست مراثی

جلد اوّل

۷۸۶

طبع ثانی کے متعلق التماس

آج سے چون سال قبل میر انیس کا کلام مجالس عزا کے ساتھ مخصوص تھا لیکن خدا خوش رکھے ڈاکٹر سر سید راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر کو کہ ان کی اس دلچسپی کی بدولت جو وہ اردو ادب کی ترقی سے رکھتے ہیں اس کی خوبیاں مجالس عزا سے نکل کر بزم ہائے ادب اردو میں خراج تحسین حاصل کرنے لگیں یا یوں کہیئے کہ اس کے اوراق مرثیہ خوانوں کے بستوں سے نکل کر خوشنما مجلدات کی صورت میں تعلیم یافتہ طبقہ کی میزوں اور کتاب خانوں کی الماریوں کی زینت بن گئے۔

سب سے پہلے اس قادر الکلام فردوسی ہند کے مراثی کے مجموعہ کی پہلی جلد ادب اردو کے سب سے بڑے محسن و مربی اعلیٰحضرت نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہ فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی میں نئی سج دھج کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں شایع ہوئی جو نظامی پریس بدایوں کے "سلسلہ آصفیہ" کی دوسری کڑی تھی۔

خدا مغفرت کرے مولانا سید علی حیدر طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر کی جنھوں نے باوجود پیرانہ سالی اور مشاغل سرکاری کے اس مجموعہ کی ترتیب و تصحیح کی زحمت اٹھائی لیکن مولانائے موصوف باوجود میرے اصرار کے اس وقت اس کا مقدمہ لکھنے کے لیئے وقت نہ نکال سکے جس کا اظہار میں نے افسوس کے ساتھ اپنے مقدمہ میں کر دیا ہے بہ مجبوری مجھ ہی کو مقدمہ لکھنا

پڑا جس میں اپنی بساط کے موافق میر صاحب کے کلام پر تبصرہ کیا اور اُن کے سوانح حیات پر روشنی ڈالی لیکن اُن کی وفات کی تاریخ و سال کا حوالہ نظرانداز ہوگیا اُسی زمانے میں سب سے پہلے میری اس فروگذاشت پر علامہ حاجی عبداللہ یوسف علی مدظلہٗ نے مجھے ٹوکا تھا اُسی وقت سے ارادہ تھا کہ طبع ثانی میں اس کمی کو پورا کیا جائے خدا کا شکر ہے کہ آج چودہ برس کے بعد یہ آرزو پوری ہوئی ہے اس کے علاوہ نکتہ چیں دوستوں نے اس اعتراف کے ساتھ کہ کتاب کی ظاہری شان دوسرے مطابع کی جلدوں سے بدرجہا بہتر ہے کتابت کی بعض غلطیوں کی طرف انگشت نمائی کی تھی۔
میں نے اس نسخہ کو جو آج دوسری مرتبہ چھپکر محترم ناظرین کے ہاتھوں تک پہونچتا ہے اغلاط سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی ایسی غلطیوں کی درستی کی نوبت آئی ہے جس سے طبع اوّل میں بعض مقامات پر نہایت بدنمائی پیدا ہوگئی تھی خدا سے دُعا ہے کہ میری یہ سعی ادب اُردو کی دُنیا میں مشکور ہو۔

میر صاحب کے کلام پر تبصرہ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے اور مجھ ہیچ میرز کی قابلیت سے بالاتر ہیں جو کچھ لکھ سکتا تھا وہ میرے مقدمہ میں موجود ہے اس لیئے اس وقت میں خود میر صاحب ہی کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

کسی نے تیری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

میر صاحب کے کلام کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے تو یہ امر خودبخود واضح ہو جائے گا کہ میر صاحب نے جو کچھ اس شعر میں کہا ہے وہ نہ تعلی ہے نہ خودستائی بلکہ واقعہ ہے اور بالکل حقیقت ہے حقیقت کیوں ہے؟ اس کا جواب بھی میر صاحب کا یہ مصرعہ دے گا۔

"پڑا جو عکس تو ذرّہ بھی آفتاب ہوا"

بدایوں ۳ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ
مطابق ۷ اپریل ۱۹۳۵ عیسوی

خاکسار
نظامی بدایونی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اساتذۂ اُردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اُس سے زبان وطرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا اُن کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر وادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اُستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اُردو میں قابل استناد ہیں اسی اہمیت کو مدنظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی۔اے (آکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شایع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیحضرت قدر قدرت ہز اگزالٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملۃ والدین نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اُردو کے کلام کی اشاعت کے لئے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شایع ہونے کی نوبت آئی۔ اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اُردو داں پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے آغا سید حسن صاحب بی۔اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت

فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری اس خواہش کو پورا نہ کر سکے اُنھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اُس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

”اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ یہ ان کی آخر عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب اتو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے۔ چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا سلیس مرحوم مٹیا برج و حیدر آباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کیے یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آ سکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کی انتہائے مشق کا کلام ہے۔ لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جُدا کرنے پڑے“۔

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہو گئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی وھوھذا:۔

تمہید

دُنیا میں جس قدر روشن دماغ اور مہذب قومیں ہیں وہ قدرتی طور پر شاعری کی دلدادہ ہیں کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے اس میں کچھ نہ کچھ ایسی روایات ضرور ملیں گی جن کو نظم کا لباس پہنا کر مشاہیر کے شجاعانہ مذہبی اور اخلاقی کارناموں کو پیش کیا گیا ہو اسی وجہ سے جملہ اصناف سخن میں رزمیہ شاعری کو فوقیت حاصل ہو اور وہ آئندہ نسلوں میں جرأت دلیری اور قومی غیرت کے جذبات پیدا کرنے کو صدیوں تک زندہ رہے گی۔ یونانی زبان میں ہومر نے الیڈ کے صفحات پر رزم بزم کی معرکہ آرائیاں پیش کی ہیں۔ لاطینی میں ورجل نے اینڈ کے اوراق میں انیس کے واقعات زندگی کا نقشہ کھینچا۔ سنسکرت میں مہابھارت کے واقعات آج تک انسانی دل و دماغ پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ انگریزی میں پیراڈائز لاسٹ میں ملٹن کے بیانات مہذب سوسائٹیوں کے دل پر یہ نقش بٹھا رہے ہیں کہ جنگ تہذیب و تمدّن کے رُخ سے نقاب اُٹھا کر انسانوں کو علوم و فنون کا مالک بنا دیتی ہو عربی میں سبعہ معلقہ کے بعض قصائد ایسے ہیں جو دلوں پر برچھی اور بھالے کا کام کر جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ داستانیں مشہور و معروف ہیں مگر اُردو میں رزمیہ شاعری کا چرچا اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ ہندوستان میں ایک ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جس نے اُردو کی رزمیہ شاعری کا نہ صرف پارسی سے رتبہ بڑھا دیا بلکہ یونانی۔ لاطینی اور انگریزی شاعری سے بھی ارفع کر دیا۔ وہ کون تھا انیس اُس نے اپنے قلم کے سمند کو اس شان سے میدان میں دوڑایا کہ ہومر۔ ورجل اور کالیداس کی روحیں ٹاپوں سے اُڑنے والے غبار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے لگیں۔ بالمکی اور بیاس اس کی علم برداری پر آفریں کہہ اُٹھے۔ اہل عرب کی رجز خوانی اور شجاعان عرب کے نعرے اس کے شکوہ و تجمل سے خجل ہو گئے اور اُس نے اپنی تیغ زبان کے جوہر سے فردوسی کی فصاحت پر پانی پھیر دیا۔ انیس نے اپنی شاعری کے جس جانگداز واقعہ کو انتخاب کیا وہ نہ صرف تاریخ کا ایک اہم جزو ہو بلکہ اس کو تہذیب و تمدّن مذہب و اخلاق سے خاص تعلق ہو اور ان کی ممدوح وہ مقدس ذات تھی جو ان کی مدح سے مستغنی تھی اس لیے اس کی مدح خود مداح کے لیے باعث مباہات ہو برخلاف اس کے فردوسی نے اپنی قوت مبالغہ

اور چرب زبانی کے زور سے اپنے ہیرو کی شجاعانہ داستانوں میں جان ڈال کر اس پر احسان کیا ہے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں ۔۔۔ وگرنہ یلے بود در سیستاں

خلاصہ یہ کہ میر انیس نے جن واقعات کو نظم کیا ہے ان سے انسانی طبائع ہمیشہ متاثر ہوتی رہیں گی اور ایک عظیم الشان مذہبی قربانی کے حالات عالم اسلام کے سنوں کو جنبش میں لاتے رہینگے۔

میر صاحب کے اسلاف میر انیس کے اسلاف ہرات کے سادات سے تھے پرانی دلی میں آکر آباد ہوئے۔ میر ضاحک میر حسن میر خلیق کے نام ادبی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ میر انیس کے دادا میر حسن عالم جوانی میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دلی سے فیض آباد (اودھ) چلے آئے تھے اور سرفراز جنگ کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے وہاں سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آپ کی مثنوی "بے نظیر بدر منیر" اردو لٹریچر میں لاجواب چیز ہے جس میں زبان کی سلاست محاورات کی خوش اسلوبی کے سوا جواہر نگار خامہ سے قدرت کے مرقعے کھینچے گئے ہیں۔

ولادت میر انیس میر خلیق کے گھر ۱۲۱۶ھ کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی جائے پیدائش دہلی کو لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا دہلی میں تو کبھی ان کا جانا بھی ثابت نہیں۔

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر صاحب اور ان کے بھائی میر مونس لکھنؤ تشریف لائے۔ میر خلیق اور اُن کے منجھلے بیٹے میر انس عرصہ تک فیض آباد میں مقیم رہے میر صاحب کے دیکھنے کو خلیق اور انس دونوں اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہے مدّت کے بعد لکھنؤ کی کشش میر انس کو بھی فیض آباد سے کھینچ لائی میر خلیق اب بھی فیض آباد ہی میں اپنے بزرگوں کے مکان میں مقیم رہے لیکن خاک اُن کی بھی لکھنؤ ہی کی تھی ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ میر انیس کی مشق سخن اس وقت

ترقی پر بھی اپنے مرحوم باپ کی قبر پر مجلسیں کرتے تھے اور ہر مجلس میں نیا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ مفتی محمد عباس صاحب مرحوم خود فرمایا کرتے تھے کہ صدرا میر صاحب نے اُن سے پڑھا تھا۔

علمی معلومات

میر صاحب کو ادبی و علمی مسایل کی تحقیق اور تدقیق کا بہت شوق تھا۔ چالیس سال کی عمر تک انھوں نے طالب علمانہ زندگی بسر کی وہ عالم نہ تھے لیکن تمام تذکرہ نویس اس بات کے متعرف ہیں کہ علمی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جس طرح میر صاحب کا گھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک علمی درسگاہ کا رتبہ رکھتا تھا اسی طرح علما و فضلا کی سوسائٹی نے ہر علم و فن کے رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تلوار کی تعریف میں آپ کا ایک مصرع ہی "ہر جزو تن کو لایتجزیٰ بنا دیا"۔ ذوق مرحوم فرماتے ہیں ع جوہر فرد تھے بالفرض تو کیا بے قسمت"۔ یہ دونوں مصرعے اپنے اپنے مصنفوں کے مبلغ علم کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ازرق کے قتل پر میر صاحب فرماتے ہیں ع لو کوفیو! گرا دیا حرفِ ثقیل کو"۔ یہ مصرعہ خبر دیتا ہی کہ کوفیین و بصریین میں تحقیق زبان و نحو عربی میں جو جو مباحثے ہوئے ہیں وہ سب مصنف کے پیشِ نظر تھے

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ

ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ خلیق اپنے دونوں بیٹوں انیس اور مونس سے ملنے کے لیے فیض آباد سے لکھنؤ آئے ان کے منجھلے بیٹے مہر علی انس ان کے ہمراہ تھے میر خلیق نے میر انیس سے کہا مہر علی انس نے جو مرثیہ اس سال کہا ہی ذرا اسے سنو اس مرثیہ پر میر خلیق کی اصلاح تھی اور وہ بیٹے سے اس اصلاح کی داد کے طالب تھے چنانچہ انیس نے مرثیہ سُن کر بہت داد دی اسی کے ساتھ کہا کہ باوا جان میر نواب (مونس) نے جو مرثیہ اسی سال کہا ہی ذرا اسے بھی سُنیے مونس نے مرثیہ سُنایا یہ کچھ چیز ہی اور تھا اس پر انیس کی اصلاح تھی اس مرثیہ کو سُنانے کی غرض بھی یہی تھی کہ میر خلیق بیٹے کی اصلاح کی داد دیں خلیق چھوٹے بیٹے کے مرثیہ اور بڑے بیٹے کی اصلاح سے بہت خوش ہوئے

چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت

میر صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی مونس سے جو بچپن سے میر صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں رہے تھے کمال درجہ کی محبت تھی باوجود صاحب اولاد ہو جانے کے کبھی شفقت مربیانہ میں فرق نہ آیا میر صاحب کے صاحبزادے میر خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ہمارا مرثیہ باوا جان کی اصلاح سے مہینوں محروم رہتا ہی اور

اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہو جاتی ہے۔

خودداری میر صاحب اس قدر خوددار اور نازک دماغ تھے کہ کوئی شخص آپ سے ملنے کے لیئے اُس وقت تک نہ جا سکتا تھا جب تک پہلے سے اس کی ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد شرف ملاقات حاصل کرتے تھے۔

خودداری کی ایک مثال حکیم مہدی سے لوگوں نے ذکر کیا کہ انتزاع سلطنت کے بعد سے میر انیس نے مجلسوں میں پڑھنا ترک کر دیا ہے اکثر لوگوں نے بہت کچھ الحاح و اصرار و اظہار شوق کیا مگر بے سود ہوا اور سب کا اشتیاق برسوں سے تقاضا کر رہا ہے کہ پھر میر صاحب کو منبر پر دیکھیں۔ حکیم مہدی نے کہا "دیکھو میں پڑھواتا ہوں انیس کو" رقعے چھپوا کر اُنھوں نے تقسیم بھی کر دیئے کہ فلاں تاریخ مجلس ہے میر صاحب پڑھیں گے میر انیس سے لوگوں نے پوچھا کہ حکیم مہدی کے یہاں آپ پڑھیں گے میر صاحب نے کہا میں تو نہیں پڑھوں گا حکیم مہدی کو یہ خبر پہونچی اُس نے اس برتے پر میر انیس کو پڑھوالنے کا دعوے کیا تھا کہ نجف کے ذاکروں میں مبارک محل میر انیس کو بھی وثیقہ مقرر کر گئی تھیں وہ وثیقہ آج تک جاری تھا مگر میر صاحب خود پڑھنے کو نجف کی مجلس میں نہ جاتے تھے۔

میر نفیس مرحوم کو حکم تھا کہ میرے بدلے تم جا کر پڑھ آیا کرو اس وثیقہ کی تولیت حکیم مہدی کو تھی اُس نے نواب غضنفر الدولہ کی وساطت سے میر صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہ پڑھیں گے تو مبارک محل کے وظیفہ سے ہاتھ دھو رکھیئے غضنفر الدولہ بہادر میر صاحب کے اخلاص مند دوستوں میں تھے اُنھوں نے بہت چاہا کہ میر صاحب کو مجلس پڑھنے پر راضی کر لیں جب دیکھا کہ اُنھیں بھی اس بات میں کد ہے کہ حکیم مہدی کے یہاں ہرگز نہ پڑھیں گے تو کہہ دیا کہ نجف سے جو وظیفہ آپ کو ملتا ہے وہ ظالم موقوف کر دے گا میر صاحب کے پاؤں میں زردوزی اوگی تھی کہنے لگے میں جانوں گا میری اوگی کے ستارے جھڑ گئے آخر نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے وظیفہ کے موقوف ہو جانے کی کچھ پروا نہ کی زوال سلطنت اودھ کا قلق میر صاحب کو برسوں رہا پڑھنا

بلکہ مجلسوں میں جانا تو ایک قلم موقوف کر دیا تھا کہتے بھی کم تھے یہ زمانہ مونس کی اصلاح میں بہت صرف ہوتا تھا ایک دفعہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کر لیا یہ خبر مشہور ہو گئی لکھنؤ کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی دور دور سے لوگ اشتیاق میں آتے تھے اہل مجلس منتظر تھے کہ انیس آئے منبر سے میر خورشید علی نفیس اُترے اُنھوں نے منبر پر جاکر پہلے یہ عذر کیا کہ سب حضرات جناب قبلہ وکعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں معذور ہوں ارشاد ہوا کہ میں اس وقت نہیں جا سکتا تو جاکر پڑھ دے۔ امتثال حکم کرتا ہوں۔ مرثیہ انیس کا بنایا ہوا اور اُن کی نظر میں کھبا ہوا بھی تھا جانتے تھے انیس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ مرثیہ نفیس کی زبان سے بھی بے رنگ دکھائے نہیں رہے گا یہی ہوا ہر شخص مجلس سے یہی کہتا اُٹھا کہ میر خورشید علی کبھی ایسا نہیں پڑھے جیسا آج پڑھے اس کے چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی پڑھنے والے تھے حیدر خاں نے آکر قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہنے لگا آپ بھی میری مجلس میں شریک ہوکر مجلس کی رونق اور میری عزت بڑھائیے میر خورشید علی صاحب کو آپ نے کبھی مجلس پڑھتے نہیں سنا سنیئے گا تو بہت خوشی ہوگی۔ میر صاحب حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے دیکھنے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادان سخن کا مجمع ہے اُن لوگوں میں ناسخ والوں میں سے بڑے خوش فکر مرثیہ گو سید صاحب تعشق بھی موجود تھے ان قدر شناسوں نے کچھ ایسا اصرار اور اشتیاق کا اظہار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں پہلی مرتبہ میر صاحب نے یہی مجلس پڑھی مگر آدھا مرثیہ پڑھا ہوگا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑ گئی کہ وہ بھی مجلس میں موجود ہیں آنکھ ملتے ہی میر صاحب پر حجاب طاری ہوا مرثیہ بند کر کے اہل مجلس سے خطاب کیا کہ باقی مرثیہ نواب فدا علی خاں صاحب کی آئندہ مجلس میں پڑھوں گا پھر نواب فدا علی خاں کے یہاں بھی پڑھے نواب ابّو صاحب کی مجلسیں بھی پڑھے یہ میر صاحب کا آخر عمر کا پڑھنا تھا۔

طبعی خصوصیات | شہسواری۔ سیف زنی۔ پٹا۔ بانک۔ بنوٹ کے فنون سے بخوبی ماہر تھے

ورزش کا شوق آخر وقت تک قایم رہا۔ چند ڈنٹر اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر ہلا لینا کبھی ناغہ نہ ہوا۔ میر صاحب کی طبیعت حسن پرستی سے خالی نہ تھی اور وہ حسن پرستی انسانی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کی نگاہ تمام موجودات عالم میں سے اپنے دل بہلاؤ کا ذریعہ پیدا کر لیتی تھی خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھ کر اُن کا ذوق وجدانی ترقی کر جاتا تھا جمادات نباتات وحیوانات کے مشاہدہ میں ان کی نظر قدرتی خوبیوں کو پا جاتی تھی۔

حلیہ اور وضع

میر صاحب کا قد لانبا تھا سر کے بال باریک اور ملایم۔ چہرہ خوبصورت کتابی رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مونچھیں بڑی اور افگندہ مو داڑھی صاف۔ گردن صراحی دار سینہ کشادہ۔ چال نہایت نستعلیق۔ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے جو وضع اُنھوں نے شروع سے اختیار کی تھی وہی آخر دم تک قایم رہی۔ سر پر بیضاوی پنج گوشہ ٹوپی رکھتے تھے اور اپنے سامنے آئینہ رکھ کر جب تک ٹوپی کو درست نہ کر لیتے اور وہ سر پر موزوں نہ معلوم ہوتی ہرگز چین نہ آتا بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ اس شغل میں صرف ہو جاتا ایک خاص وضع کا گھیردار کُرتہ گول پردہ کا انگرکھہ زیب جسم فرماتے تھے۔ ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا پاؤں میں لکھنؤ کا زرد مخملی اور اکثر زر دوزی جوتہ۔

معاصرین

جس زمانہ میں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سرائی اور میر ضمیر و خلیق کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے میر خلیق نے اپنے پیارے بیٹے کو بھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے اور خاص خاص مجالس میں ان کو اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ آخر وہ دن آیا کہ شایقین کے اصرار سے میر خلیق نے انیس کو منبر پر بٹھا دیا۔ میر صاحب جب پہلی مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے تو اوّل تو چند لمحہ تک خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے دلوں پر گہرا اثر ڈالا چاروں طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے ایک سلام پڑھا جس نے تمام

مجلس کو گرویدہ بنا لیا۔ پھر اس شان سے مرثیہ شروع کیا کہ آپ کی فصاحت اور بلاغت نے محفل کو گرما دیا رزم و بزم کی تصویروں پر ارباب سخن غش ہو گئے اور مرثیہ ختم ہونے کے بعد قدرشناس اپنی جگہ سے اُٹھ کر مصافحہ کرنے لگے اور ہاتھ چومنے لگے۔ خوش نصیب باپ کی زندگی ہی میں آپ کی مرثیہ گوئی کا شہرہ ہو گیا اس وقت جبکہ لکھنؤ میں میر صاحب کے کلام کا چرچا ہو رہا تھا سخی گروہ کے بعض شعرا کو ماہرین فن سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے جواب کہنے کی طرف توجہ کی۔ حرملہ کے تیر مارنے کا ذکر میر علی اوسط اشک نے اس طرح نظم کیا ؎

حلقِ اصغر بازوے سرور دلِ نہراچھدا — رن کہاں جنت کہاں اللہ رے پلہ تیر کا

عشق کہتے ہیں ؎

علم کا جب پھرہرا دوش پر عباس کھولا — پکارے جعفرِ طیار شہپر ایسے ہوتے ہیں

علم کا لچکنا دیکھیے ؎

عالم عجب لچکنے میں ہے آب و تاب کا — پنجہ بجھا رہا ہے چراغ آفتاب کا

ان لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر میر انیس کا جواب نہ ہوا انیس کی شاعری کا جو خاص میدان تھا اُس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی تھی حرِ شہید کا لشکرِ یزید سے علحٰدہ ہونا ایک تصویر ہے جو انیس نے کھینچ دی ہے ؎

کس لشکرِ بد خو سے بگڑ کر نکل آیا — ڈولا کھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا
تنتا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا

پھر حُر کی آمد لشکرِ یزید میں تصویر نہیں کرامات ہے ؎

زورِ بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے — دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دب کے فرزانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

پسرانِ زینب کی تصویریں دیکھیے ؎

وہ نیچے ہلال کے دم خم ہو جن کو فوق — جرات کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق

ہنس ہنس کے زخم کھائیں نہ بانوں کو اس کا ذوق
گیسوؤں پہ کانوں بیں بندے گلوں میں طوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

دونوں بھائیوں کا ہجوم فوج میں ساتھ چھوٹ جانا اور پھر بھائی کا ایک مل جانا میر صاحب کی معجزہ بیانی کا ایک کارنامہ ہے ملاحظہ ہو ؎

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا
دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا
جب شیر سا پہونچا وہ اُدھر یہ ادھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا
بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیغوں کے تلے سے
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

لشکر یزید میں کیسے کیسے سنگدل تھے سب جانتے ہوں گے مگر انیس نے اُن لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا ؎

کہتا تھا کوئی تیر کو چلّہ میں جوڑ کے
گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
سوئیں گے جب یہ بن پہ جھولے کو چھوڑ کے
دونوں کڑے اُتاروں گا پہونچے مروڑ کے

شاہزادہ علی اکبر کی امام حسین سے رخصت ؎

تسلیم کر کے بولے علی اکبر غیور
لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور
برچھی لگا کے دل پہ خوش آمد یہ کیا ضرور

پھوپی کو بھتیجے سے شکایت ہے ؎

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی
بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی
رو ئیں بہشر پہ ان کو رُلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خردسال
پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال

راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال — میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے نونہال ہنستے تھے

پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر بھی حریف بن کر مرثیہ گوئی کے میدان میں نمودار ہوئے اور دونوں کی شہرت حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے گوش گزار ہوئی۔ مفتاح الدولہ کے ذریعہ سے دونوں مرثیہ پڑھنے کے لئے شاہی امام باڑہ میں بلائے گئے پہلے مرزا دبیر وقت پہنچے اور حضور میں باریاب ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے گھڑی گھڑی کی خبریں بھیجنے کا انتظام کر لیا تھا جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب پہونچ گئے تو اپنے جانے میں قصداً دیر لگانا شروع کر دی یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آ گیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی پینس سامنے حاضر تھی اس میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُن سے کہا آپ حضرت جانعالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دُعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر صاحب کو اپنی خودداری کا خیال کہاں تک تھا۔ بادشاہ کی طرف سے پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رُباعی پڑھی جس پر چاروں طرف سے آفریں کی صدائیں گونج اُٹھیں پھر میر صاحب کو پڑھنے کے لئے ارشاد کیا گیا۔ اُنھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں ایک رباعی پڑھی جس کو سُن کر سامعین پر وجد طاری ہو گیا اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر

مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سُلیماں ہو کر

لکھنؤ سے باہر کی مجلسیں

لکھنؤ کے علاوہ میر صاحب کو عظیم آباد الہ آباد و حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا جہاں کہیں بھی آپ نے مرثیہ پڑھا ماہران فن کے دلوں پر اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا حیدرآباد میں آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ وہاں ایک صاحب نے میر صاحب کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میر کی شاعری کا پایہ بھی آپ کے سامنے پست نظر آتا ہے فرمایا کہ میر غزل کے اُستاد تھے میں ایک مرثیہ گو مجھے اُن سے کیا نسبت اُنھوں نے کہا جناب عالی میرا قول بے دلیل نہیں مقابلہ کر لیجیے میر کا مطلع ہے ؎

اُس زلف پہ محو ہو گئے ہم　　یعنی سرِ شام سو گئے ہم

اور آپ (میر انیس) فرماتے ہیں ؎

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم　　ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

اپنے اور میر تقی کے مطلع کو سُن کر میر صاحب کو جواب دیتے کچھ نہ بن پڑا مسکرانے لگے۔

میر صاحب کی مرثیہ گوئی کا طرۂ امتیاز اور اس کی مثالیں

میر صاحب کی شاعری پر تنقید کرنا صرف اس شخص کا کام ہے جو خود بھی اس فن کے نکات سے آگاہ ہو لیکن ہر شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان میں اُنھوں نے اس فن کو ایسی ترقی دی کہ ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

مرثیہ گوئی کا فن نیا فن نہیں ہے انسانی نسل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ عربی تاریخوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس وقت جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے اپنی موزونیت کے اعتبار سے وہ شعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایام جہالت کے اکثر مرثیے عربی کی ادبی کتابوں میں موجود ہیں فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے مقبل مخلص محتشم وغیرہ شعرائے فارسی زبان میں حسرت و یاس کے دردناک مناظر پیش کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی ہے اُردو شاعری میں بھی میر انیس کے زمانہ سے قبل مرثیہ گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت میر تقی

میرؔ نے اپنے مشہور تذکرہ نکات الشعرا میں یک رنگ معاصر میاں آبرو کی تصنیف سے یہ اشعار درج کیے ہیں جو بطور مرثیہ کے لکھے گئے تھے:۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہو بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہو زخمِ ستم ظالموں کے ہاتھ — دھو ہاتھ زندگی ستی میدانِ کربلا
اندھیر ہو جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہو سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

اشعار مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہو کہ قدیم اُردو میں جو مرثیے لکھے جاتے تھے بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے پھر ایک ایسا دور شروع ہوا جس میں مراثی مسدس کے طرز پر لکھے جانے لگے اور میر ضمیر و میر خلیق کے زمانہ میں یہ ایک مستقل فن ہوگیا اور آخر میں میر انیس کی طبع رسا نے ترقی دے کر اس کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اور مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کر دیا۔ میر صاحب نے مناظر فطرت کے جس حصّے پر توجہ کی کمال کر دکھایا مثلاً صبح کا سین اُنھوں نے اس خوبی سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ شاعر نے صحیفۂ فطرت کو کس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اسی مرثیہ کی بیت ہو ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس ٹیپ میں میر صاحب نے صبح کی جس کیفیت کو پیش کیا ہو اس کا پورا لطف اُسی شخص کو آسکتا ہو جس کو علم الحیوانات تک دسترس حاصل ہو۔ آفتاب کی تمازت کا جو قدرتی اثر انسان حیوان

اور جمادات پر ہوتا ہے اس کا بیان جن الفاظ میں فرمایا ہے اس سے بہتر نقشہ کسی دوسرے شاعر کے قلم سے کھینچنا ناممکن ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوکا وہ چلنا
وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا
اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے چرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے
اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دودو دم ہیں منہ آب میں ڈالے
ریتے میں دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی سی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکنے پہ زمیں گرم ہوئی ہے

ایک موقع پر خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھرائی ہوئیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

جس گھر میں اہل بیت اطہار کو یزید نے قید کیا تھا اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

شکل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ
تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دود آہ
حجرے سے چشم تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر
ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر

تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

سید الشہدا کی سیف زنی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اُگلنے لگی تلوار پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

حضور کا سراپائے مبارک لکھتے ہوئے کس قدر نفیس استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب نکلا ہے چیر کر شب یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب رخصت ہو مل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے اور یزیدی فوج کے لوگوں کی کیفیت لکھنے میں جو کمال ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اس بند سے ہو سکتا ہے ؎

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہلِ نار و دغاباز و پُر دغل شکلیں مہیب ہو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

علی اکبر کو رن کی اجازت دینے کے موقع پر بی بی زینب کی زبان سے ماں کی فطرتی محبت کا موازنہ

پھوپی کی محبت سے کیا ہی وہ قابل ہزار ستایش ہی کہتے ہیں ؎

سچ ہی کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں — ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہی ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں — آ نچ آ تما کی ہی وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خبر ہی
ماں ہی تو ماں ہی خلق میں پھر غیر غیر ہی

گھوڑے کی تعریف میر صاحب نے اکثر موقعوں پر لکھی ہی لیکن جس طرح ایشیائی شاعر قصیدوں میں اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں انتہائے مبالغہ سے کام لیکر اپنے کلام کو مبتذل بنا دیتے ہیں اس سے میر صاحب کا کلام مبرّا ہی اور ان کے یہاں بھی مبالغہ ہی لیکن لطف سے خالی نہیں اور اس کی صرف یہ وجہ ہی کہ اس میں بھی اکثر فطرتی مضامین میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں مثلاً کہتے ہیں :-

لکھتا ہی اوہم قلم اب سرعتِ عقاب — نعل اس کے ماہِ نو ہیں تو سم رشکِ آفتاب
پستی میں سیل ہی تو بلندی میں ہی سحاب — سرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں ہی فرس کو پرندوں پہ اوج ہی
ایک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہی

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا ادھر گیا — چمکا بڑھا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑکے برچھیوں سے بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

فطری مضامین میں اضطراب استقلال۔ فراق ووصال وفاداری بے ثباتیِ دنیا۔ انقلابِ عالم غرض کوئی مضمون ایسا نہیں ہی جس میں میر صاحب کے قلم نے شیکسپیر اور کالیداس سے زیادہ ڈرامانگاری کی قوت نہ دکھائی ہو اگر یہ قوت میر صاحب کے قلم میں نہ ہوتی تو میر صاحب کو اعلے درجہ کے رزمی شاعر (ایپک پوئٹ) کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا میں اگر اس مختصر دیباچہ میں ہر مضمون کے

بندوں کو مثال میں پیش کروں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس لیئے میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ ناظرین جس وقت ان مراثی کو جو اس جلد اوّل کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیئے جاتے ہیں مطالعہ فرمائیں گے تو وہ خود انصاف سے کہدیں گے کہ میر صاحب بلاشبہ فطری شاعر تھے اور ان کی فطرت نگاری دلوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے اُردو شعرا میں مناظر فطرت کی طرف ان کا میلان طبعی تھا۔ اور فطرت پسند اور فطرت شناس طبیعت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے لاجواب ہے ان کا انداز بیان دلکش ہے جس واقعہ کو نظم کیا ہے اس کو ترتیب کے سلسلہ میں ایسا منسلک کیا ہے کہ سبحان اللہ ؎

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں ہیں | جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ایک نئی طرز کی ایجاد سے اُردو شاعری کو فی الواقع آپ نے چار چاند لگا دیئے جیسا خود فرما گئے ہیں ؎

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر | مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
میری قدر کر اے زمینِ سخن | تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر صاحب کے ان اشعار کو شاعرانہ تعلّی نہ سمجھنا چاہیئے اس میں بہت کچھ واقعیت موجود ہے اُن کے مراثی پر گہری نظر ڈالنے سے ان کے اس بیان کی کہ ؎

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا | یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا | مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے نکتہ چیں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اور ڈراما نگاری کے اعلٰے اصول کی پابندی کے ساتھ اُنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی جلا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے دیگر شعرا کی نسبت اُنھوں نے اپنے کلام میں اُردو کے سب سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیئے ہیں

اور اگر اسی ایک بات کو معیارِ کمال قرار دیا جائے تو بھی بقول مولانا حالی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ مرزا دبیر جن کا ذکر اس مقدمہ میں ایک موقع پر آچکا ہو میر صاحب کے ہمعصر بلکہ مدمقابل مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں اور آج بھی ایک گروہ مرزا صاحب کے کلام کو میر صاحب کے کلام پر ترجیح دینے والا ملک میں موجود ہو۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر ایک مستقل کتاب موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ کیا ہو۔ اس کے بعد دوسری کتاب المیزان لکھی گئی جس میں **موازنۂ انیس و دبیر** کے مصنف کی بعض رایوں پر جو اس نے میر صاحب کے کلام کے متعلق دی ہیں نکتہ چینی کی گئی ہو۔ مولانا آزاد نے تذکرۂ آبِ حیات میں مرثیہ گوئی کے ان دونوں پہلوانوں کے متعلق جو فیصلہ کیا ہو وہ یہ ہو:-

"میر انیس صفائیِ کلام لطفِ زبان۔ چاشنیِ محاورہ۔ خوبیِ بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے مگر مرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اُس میں جابجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنائے، دلگداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہو بادشاہ تھے۔"

لیکن ان سب رایوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایک غیر جانبدار شخص جو نہ **انیسیوں** میں ہو نہ **دبیریوں** میں وہ صرف اُردو ادب کی گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالت پر نگاہ رکھ کر مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو

"میر انیس اُردو شعرا میں سب سے زیادہ برتر تھے"

انتقال دنیائے مرثیہ گوئی کا یہ آفتاب عالمتاب ۷۱ سال درخشاں رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۴ء بروز جمعہ اور بقول صاحب "یادگار انیس" ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ روز دوشنبہ تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں غروب ہوگیا۔ قبر اپنے مملوکہ باغ واقع سبزمنڈی لکھنؤ میں موجود ہو مگر اچھی حالت میں نہیں ہو ۱۹۳۳ء میں مقبرہ تعمیر ہونے کی تحریک کی گئی تھی۔ کاش یہ تحریک جلد سے جلد عملی صورت اختیار کرے اور ثبوت قدرشناسی کی یادگار ثابت ہو۔

خاکسار **نظامی بدایونی** ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء

نظرثانی ۷ اپریل ۱۹۳۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرثیہ (۱)
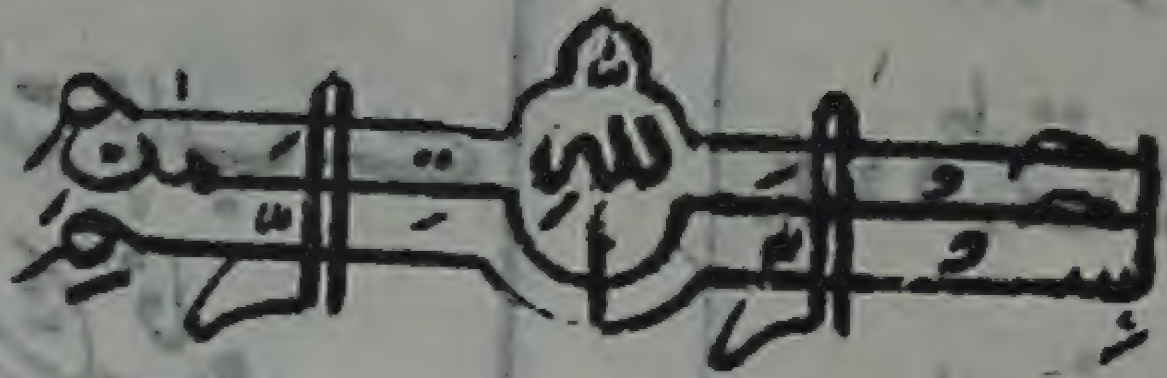
دشتِ وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہے
ذرّوں میں روشنیٔ تجلّیٔ طور ہے
اک آفتابِ رُخ کی ضیا دور دور ہے
کوسوں زمیں عکس سے دریائے نور ہے
میدانِ کربلا ہے نمونہ بہشت کا
اللہ رے حسن طبقۂ عنبر سرشت کا

حیراں زمیں کے نور سے ہے چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہے رُخِ آفتاب زرد
ہے روکشِ فضائے ارم وادیٔ نبرد
اُٹھتا ہے خاک سے تتقِ نور جائے گرد
ذرّے نہیں زمیں پہ ستارے چمکتے ہیں
حیرت سے حاملانِ فلک اُن کو تکتے ہیں

ہے آبِ نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر
تاباں ہے مثلِ چشمۂ خورشید ہر بھنور
لہریں بسانِ برق چمکتی ہیں سربسر
پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر
دریا تو آسمان ہے ستارے حباب ہیں
یہ آب و تاب ہے کہ گہر آب آب ہیں

پرتوفگن ہوا جو رُخِ قبلۂ انام
مشہور ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
اور سنگریزے دُرِّ نجف بن گئے تمام
صحرا کو مل گیا شرفِ وادی السلام
خاک اُس زمینِ پاک کی خاکِ شفا ہوئی
کعبہ سے اور نجف سے بھی عزّت سوا ہوئی

پھیلا جو نورِ مہرِ امامت دمِ زوال
ذرّوں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال
سارے نہال فیضِ قدم سے ہوئے نہال
اختر بنے جو پھول تو شاخیں بنیں ہلال
صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے
پتّے تمام آئینۂ نور ہو گئے

غل تھا نہ ہے حسین کی شوکت نہ ہے وقار
رُخ سے عیاں ہی دبدبۂ شاہِ ذوالفقار
کیونکر چھپے نہ ماہِ دو ہفتہ حجاب سے
یہ روئے روشن اور یہ گیسوئے مشک فام
ہالے میں یوں نظر نہیں آتا مہِ تمام
زلفوں میں جلوہ گر نہیں چہرہ جناب کا
قرباں کمانِ ابروئے مولا پہ جان و دل
چشمِ غزالِ دشتِ ختن چشم سے خجل
پتلی بسانِ قبلہ نما بے قرار ہی
رخسار ہیں ضیا میں قمر سے زیادہ تر
ریشِ مخضب اور یہ رُخِ شاہِ بحر و بر
قرآن سے عیاں ہی بزرگی امام کی
کس منہ سے کیجیے لبِ جاں بخش کا بیاں
کیا دُرِّ آبدار ہیں اس درج میں نہاں
ذرّے زمیں پہ عکس سے سارے چمک گئے
شمعِ حریمِ لم یزلی تھا گلوئے شاہ
اے چرخِ بے مدار یہ کیسا ستم ہی آہ
جس پر رسولؐ ہونٹوں کو ملتے ہوں پیار سے
منظور یاں تھی مدح گلوئے شہِ امم
مسجد میں جلوہ گر تھے رسولِ فلک حشم
روشن تھے بام و درِ رُخِ روشن کے نور سے

گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوبِ کردگار
ہی نورِ حق جبینِ منوّر سے آشکار
چودہ طبق میں نور ہی اس آفتاب سے
یاں شام میں تو صبح ہی اور صبح میں ہی شام
قدرت خدا کی نور کا ظلمت میں ہی مقام
ہی نصف شب میں آج ظہورِ آفتاب کا
گر ماہِ نو کہیں تو ہی تشبیہ مبتذل
دیکھا جسے کرم سے خطائیں ہوئیں بحل
گریاں ہیں وہ یہ گردشِ لیل و نہار ہی
جن پر ٹھہر سکی نہ کبھی شمس کی نظر
پیدا ہیں صاف معنیِ واللیل والقمر
کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی
چوسی جنھوں نے احمدِ مختار کی زباں
گویا کہ موتیوں کا خزانہ ہی یہ دہاں
جس وقت یہ کھلے تو ستارے چمک گئے
تاریک شب میں جیسے ہویدا ہو نورِ ماہ
شمشیرِ شمر اور محمدؐ کی بوسہ گاہ
کٹ جائے کربلا میں وہ خنجر کی دھار سے
یاد آ گئی مگر یہ حدیثِ غم و الم
ملتے تھے ذکرِ حق میں لبِ پاک دم بدم
آئینہ بن گئی تھی زمیں تن کے نور سے

تھا جو ستون کہ رُکنِ رسالت کا تکیہ گاہ
کرسی بھی اُس کی پشت کی تھی ڈھونڈھتی پناہ
تھا جس حصیر پر دو عالم کا بادشاہ
حسرت سے عرش کرتا تھا اُس فرش پر نگاہ
اوجِ زمینِ بہشتِ بریں سے دوچند تھا
منبر کا نہ فلک سے بھی پایا بلند تھا

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
تاباں تھا بیچ میں وہ مہِ ہاشمی لقب
سر پر ملک صفات مگس راں تھے دو عرب
جبرئیلؑ تہہ کئے ہوئے تھے زانوے ادب
خادم بلال و قنبرِ گردوں اساس تھا
نعلین اُس کے پاس عصا اُس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ مفسّرِ "واللیل اذا سجا"
رُخ سے عیاں تھے معنیِ والشمس والضحیٰ
وہ ریشِ پاک اور رُخِ سردارِ انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھلا ہوا
اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر
سردارِ دیں علیؑ ولیِ خلق کا امیر
دونوں جہاں میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر
احمد تھے آفتاب تو حیدر مہِ منیر
ظاہر میں ایک نور کا دوجا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو وہی ایک نور تھا

مصروفِ وعظ و پند تھے سلطانِ مشرقین
جو گھر سے نکلے کھیلتے زہرا کے نورِ عین
نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا نہ چین
بڑھ جاتے تھے حسنؑ کبھی آگے کبھی حسینؑ
کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اُٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں اِدھر اُدھر
کُرتے گلوں میں نورِ بدن جن سے جلوہ گر
اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر
رشکِ ہلال طوق گلے غیرتِ قمر
ہیکل پہ نقش نامِ خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پرِ جبرئیلؑ کے

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گلبدن
خوشبو سے صحنِ مسجدِ جامع بنا چمن
تسلیم کو حسینؑ سے پہلے جھکے حسنؑ
خوش ہو کے مسکرانے لگے سرورِ زمن
بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسولؐ ملک اُٹھ کھڑے ہوئے

بیٹوں کو تھا علیؑ کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ
پھیلا کے ہاتھ بولے محمدؐ کہ آؤ آؤ
بھائی حسن جو آپ کی گودی میں آ گئے
بولے حسن کہ واہ ہمیں اور کریں نہ پیار
بولے بچشم نم یہ حسینِ فلک وقار
سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں ان کے پیارے ہیں

بھائی سے تب کہا یہ حسن نے بالتفات
نانا ہمارے کیا نہیں سلطانِ کائنات
غصہ نہ اتنا چاہیئے خوش خو کے واسطے
یہ سن کے منہ علیؑ کا لگے دیکھنے رسولؐ
میں چاہتا ہوں ایک کی خاطر نہ ہو ملول
ہووے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو

شبیرؑ سے پھر اشارہ کیا ہو کے بے قرار
پھر بولے دیکھ کر سوئے شبیرؑ نامدار
چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جان کر
دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر
لپٹے حسینؑ ہنس کے ادھر اور حسنؑ ادھر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا

پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین
بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین
جھک جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے

لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ
شبیرؑ نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ
ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائیں گے
اقرار کر چکے ہیں شہنشاہِ نامدار
دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار
آگے نہ بڑھیئے آپ کہ نانا ہمارے ہیں

بے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم ای نکو صفات
ہوتی ہے ناگوار تمھیں تو ذرا سی بات
مچلے تھے یونہی بچہ آہو کے واسطے
ہنس کر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول
روئیں گے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتولؑ
تم تو حسنؑ کو گود میں میں لوں حسینؑ کو

غصہ نہ کھاؤ پہلے تمھیں کو کریں گے پیار
آ ای حسینؑ آ تری باتوں کے میں نثار
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر
پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
تھے پاؤں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر
گردن میں ایک ان کا اور اک ان کا ہاتھ تھا

گہہ جانبِ حسنؑ تو کبھی جانبِ حسینؑ
تھا ان کو لطف قلب کو راحت جگر کو چین
ان کا گلا تو ان کا دہن چومنے لگے

شبیرؑ چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب
بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب
غیرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اُٹھے حسینؑ زانوے احمدؐ سے خشمگیں
رُخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
غصہ سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

بیت الشرف میں آئے جو شبیرؑ نامدار
دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہ زہرا جگر فگار
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا
کرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار
ہی ہی حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہی اشکبار
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا

میرا کلیجہ پھٹتا ہی ای دل رُبا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں ای مہ لقا نہ رو
میری طرف تو دیکھو کہ بیتاب ہوتی ہوں
زہرا ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رو
چادر سے منہ کو ڈھانکے لو میں بھی روتی ہوں

تو منہ تو کھول ای مرے شبیرؑ خوش خصال
مَل مَل کے پشتِ دست سے آنکھیں کرو نہ لال
گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال
سلجھاؤں آؤ اُلجھے ہوئے گیسوؤں کے بال
سمجھی میں کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمھیں لاکھ گر منائیں
گزری ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں
لو آؤ جانے دو تمھیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسنؑ نے رولایا بُرا کیا
پوچھوں گی کیا نہیں مرے پیارے نے کیا کیا

بولے حسینؑ ہم تو ہیں اس بات پر خفا
نانا نے چومے بھائی کے ہونٹھ اور مرا گلا
تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا
کچھ بولے ناگوار ہی میرے ذہن میں کیا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رُلاتے ہیں

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہرا جگر فگار
چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار
یہ مشک ہیں مہک نہ گلِ یاسمن میں ہے

کہنے لگے حسینؑ یہ ماں سے بچشمِ نم
یہ کیا انھیں پہ لطف و عنایت ہے دم بدم
رو رو کے جان آج ہم اپنی گنوائیں گے

یہ بات سن کے ہو گیا زہرا کا رنگ فق
صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سرِ پُر نور پر ردا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبندِ مصطفےٰ
پیشِ نبیؐ حسینؑ کو گودی میں لاتی ہیں

اللہ ری آمد آمدِ زہرا کا بند و بست
احمد کے گرد و پیش سے اُٹھے خدا پرست
آئیں تو شاد شاد رسولِ زمن ہوئے

تعظیمِ فاطمہؑ کو اُٹھے سیّد البشر
خم تھے حسینؑ دوش پہ ماں کے جھکائے سر
ماں کہتی تھی نہ رو و مگر چپ نہ ہوتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوبِ ذوالجلال
بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال
آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں

بوئے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار
تم کو زباں چوساتے تھے محبوبِ کردگار
خوشبو اسی دہن کی تمھارے دہن میں ہے

کیا جانو تم حسن سے ہیں چاہتے ہیں کم
معلوم ہو گیا انھیں پیارے نہیں ہیں ہم
پانی نہ اب پئیں گے نہ کھانے کو کھائیں گے

بولی پسر سے رو کے وہ بنتِ رسولِ حق
ہے ہے یہ کیا کہا مجھے ہوتا ہے اب قلق
کاہے کو ماں جیئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

موزے پہن کے گود میں شبیر کو لیا
فضّہ نے بڑھ کے بوذر و سلماں کو دی صدا
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہؓ مسجد میں آتی ہیں

ساتوں فلک تھے اوجِ شرافت ہے جس کے پست
انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرتِ نشست
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوئے

دیکھا کہ چشمِ فاطمہؑ ہے آنسوؤں سے تر
تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لے لے کے روتے تھے

روتا ہے کیوں حسینؑ یہ کیا ہے تمھارا حال
رویا ہے یہ حسینؑ کہ آنکھیں ہیں دونوں لال
شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رُلاتے ہیں

ہاتوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہِ بحر و بر
رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر
حیدرؑ سے پوچھئے مری عسرت کے حال کو
اشک اُس کے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہِ نیک خو
روئے ہیں پھوٹ پھوٹ کے یہ میرے روبرو
دیکھا نہ تھا یہ میں نے جو حال اُس کا آج ہے
شفقت سے آج آپ نے چومے حسنؑ کے لب
رُتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب
اس کو جو ہو خوشی تو دل اُس کا بھی شاد ہو
آپ اُن کے ناز اُٹھاتے ہیں یا شاہِ بحر و بر
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر
روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں
یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشم تر
آئے حسینؑ ہاتھ جو نتھے سے جوڑ کر
رہ رہ کے دیکھتے تھے علیؑ و بتولؑ کو
تھی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تمام نم
گاہے ستوں سے لگ کے ہوئے راست گاہ خم
ہو سکتا تھا نہ ضبط شہِ مشرقین سے
شبیرؑ رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے
ہلنے لگے گا عرشِ معلّٰی نہ روئیے
سو بار دن میں ہم تو منہ اشکوں سے دھوتے ہیں

شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم ہے نظر
مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر
کس کس دُکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو
اُتنا ہی گھٹ گیا ہے مرے جسم کا لہو
تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو
حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے
بوسہ لیا نہ اُن کے لبوں کا یہ کیا سبب
میں سچ کہوں یہ سُن کے مجھے بھی ہوا عجب
چھوٹے سے چاہیئے کہ محبّت زیادہ ہو
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
گیسو دیئے ہیں ننّھے سے ہاتھوں میں بشتر
مُنہ کے نہ چومنے کا گِلا کرنے آئے ہیں
لو جا کے اب نبی کے قدم پر جھکاؤ سر
بے اختیار رونے لگے سید البشر
نزدیک تھا فلق سے غش آئے رسول کو
فرطِ بُکا سے خاک پہ جھکتے تھے دم بدم
ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسینؑ سے
روئیں گے اب نہ ہم شہِ والا نہ روئیے
پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجا نہ روئیے
حضرت ہمارے رونے پہ کاہے کو روتے ہیں

گھبرا گئے علیؑ ولیِ شاہِ بحر و بر
بیٹی نثار ہو گئی یا سیّد البشر
جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں

حضرت کو علمِ غیب ہی یا شاہِ انس و جاں
کیا آئی آج وحیِ خداوندِ دو جہاں
فاقوں میں کانپتی ہوں مصیبت جہان کی

بولے جگر کو تھام کے محبوبِ ذوالجلال
کس منہ سے میں کہوں کہ قلق ہی مجھے کمال
ماتم کی یہ خبر ابھی جبریلؑ لائے تھے

الماس پی کے ہوئے گا بے جاں ترا حسنؑ
بھر جائے گا کلیجے کے ٹکڑوں سے سب لگن
سوئے بہشت جب جہاں سے سدھاریں گے

زہراؑ مجھے کلام کی طاقت نہیں ہی اب
اک بن میں تین روز رہیں گے یہ تشنہ لب
نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نورِ عین کا

روئے خبر یہ کہہ کے جو محبوبِ ذوالمنن
زہراؑ پکاری ہائے لٹے گا مرا چمن
یہ کیسی آگ ہی کہ مری کوکھ جل گئی

فریاد یا نبیؐ شہِ ابرار الغیاث
ای بے کسوں کے وارث سردار الغیاث
قدرت ہی سب طرح کی شہِ مشرقین کو

کی عرض فاطمہؓ نے جھکا کے قدم پہ سر
کیا وجہ ہی جو آپ ہیں اس طرح نوحہ گر
رونا خدا کے دوست کا یہ بے سبب نہیں

آئندہ و گزشتہ کا سب حال ہی عیاں
ہونا ہی جو حسینؑ پہ مجھ سے کرو بیاں
کیوں بابا جان خیر تو ہی اس کی جان کی

تجھ سے سنا نہ جائے گا ای فاطمہؓ یہ حال
زہراؑ شہید ہوویں گے تیرے یہ دونوں لال
سارے ملک حسینؑ کے پرسے کو آئے تھے

یہ وجہ ہی کہ چومتا ہوں اس کا میں دہن
ہوگا زمردی ترے اس لال کا بدن
بدکیش تیر اس کے جنازے پہ ماریں گے

حلقِ حسینؑ چومنے کا کیا کہوں سبب
کٹ جائے گا گلا ہی خنجر سے ہی غضب
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسینؑ کا

گھبرا کے منہ حسینؑ کا تکنے لگے حسنؑ
میں مرگئی دہائی ہی یا سرورِ زمن
ہی ہی چھری کلیجے پہ زہراؑ کے چل گئی

ای مسلمانِ حق کے مددگار الغیاث
ای جزو و کل کے مالک و مختار الغیاث
حضرت سے لونگی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

یہ کہتی تھی زینب کہ پکارے شہِ عادل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل
چلتی ہی ہوا سرد ابھی وقتِ سحر ہی
رخصت کرو اُن کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے
ڈر ہی کہیں گھبرا کے دم اُس کا نہ نکل جائے
رخصت کو ابھی قبرِ پیمبرؐ پہ ہی جانا
اماں کی لحد پر ہی ابھی اشک بہانا
آخر تو لیئے جاتی ہی تقدیر وطن سے
سُن کر یہ سخن بانوے ناشاد پکاری
غش ہوگئی ہی فاطمہ صغرا مری پیاری
اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
ماں ہوں ہی کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا
ہیں تو اُسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہی
چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھیں تو کھولو
ہم جاتے ہیں تم اُٹھ کے بغل گیر تو ہولو
تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
ہشیار ہو کیا صبح سے بے ہوش ہو خواہر
چھاتی سے لگو اُٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر
افسوس اسی طور سے غفلت میں یہ ہوگی
تیار رہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہی
کہدو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
جانے کی خبر میری نہ صغراؑ کہیں پائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے
کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہوئے مرا آنا
اُس مرقدِ انور کو ہی آنکھوں سے لگانا
چلتے ہوئے ملنا ہی ابھی قبرِ حسن سے
میں لُٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
کس کے لیئے کہتے ہیں سب گریہ و زاری
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں
صاحب مرے دل کو ہی کوئی ہاتھوں سے ملتا
رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اُس کا بہلتا
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہی
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اُٹھا کر
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کروگی

سُن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے
جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سیّدِ خوش خو
بیمار نے پائی گُل زہرا کی جو خوشبو
ماں سے کہا مجھ میں جو اس آئے ہیں امّاں
ماں نے کہا ہاں وہی آئے ہیں مری جاں
دیکھو تو ادھر روتی ہیں بی بی شہِ ذیشاں
وہ کونسا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیئے باہر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے امّاں
شبیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیدِ مظلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب ڈلے ہیں صغرا
اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دُشوار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
غربت میں بشر کے لیئے سو طرح کا ڈر ہے
لو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے

بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے
دانستہ میں کیونکر اُسے لے جاؤں سفر میں
اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں امّاں
جو کہنا ہے کہلو کہ یہاں اور ہے ساماں
صغرا نے کہا اُن کی محبت کے میں قرباں
کُھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا
نہ فرش نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر
اُجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے امّاں
صغرا کے لیئے رونے لگیں زینب و کلثوم
پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا
ہیں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار
تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہی سر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہونگی سفر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
شہ بولے کہ واقف ہی مرے حال سے اللہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا

ای نورِ بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
تپ ہی تجھے اور غم سے جگر ہی مرا جلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہ عالم
وہ درد ہی جس درد سے چارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہی نہ وہ پیار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا

پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
تبرید فقط آپ کا ہی شربتِ دیدار
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا
اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
یاں نیند کب آتی ہی جو واں سوے گی صغرا

ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بناکر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہی جو راہ
ایسا بھی کوئی ہی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ہی مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا
چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موے ہم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہی اس دم
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

سب کی یہی مرضی ہی کہ مر جائے یہ بیمار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
سچ ہی کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
کیا اُن کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے

کل تک تو مرے حالِ پریشاں پہ نظر تھی
مانوس سکینہ سے ہیں عباسِ دلاور
سرسبز رہے خلق میں نوبادہ شبیر
بے دولہا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و رنجور

امّاں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی ہیں ہوں مجبور
دُنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
سب بی بیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
پاس آن کے اکبر نے کی یہ پیار کی تقریر
چلّانے لگی چھاتی پہ مُنہ رکھ کے وہ دلگیر
صدقے ترے سر پر سے اُتارے مجھے کوئی

اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدّر
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے
میں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
زلفیں جو اُلجھتیں تو سلجھوانے کو آتے

تقدیر کے اس پیچ کی مجھکو نہ خبر تھی
میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر
شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور

ہمراہیِ بیمار کسی کو نہیں منظور
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا
چھاتی سے لگا کر اُسے کہنے لگے شبیر
منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
روٹھی ہے بہن تم سے گلے اُس کو لگاؤ
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے
افسوس ہے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے
جلد آن کے بھینا کی خبر لیجیو بھائی

لکھنا مجھے نسبت کا اگر ہو کہیں سامان
اور مر گئی پیچھے تو ہے دل میں یہ ارمان
خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبرؑ
دل سینے میں کیونکر تہہ و بالا نہ رہے گا
کیا گزرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی
تشریف خدا جانئے کب لاؤ گے بھائی

کیا دم کا بھروسا کہ چراغِ سحری ہیں
ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا
بھیّا جو اب آنا تو مری قبر پہ آنا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے غم اس کا نہیں زنہار
قبلہ کی طرف کون کرے گا رخِ بیمار
سانس اکھڑے گی جس وقت تو فریاد کروں گی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا

تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
کیوں روتے ہو اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

حق دار ہوں میں نیگ کا میرے بھی ہے دھیان
لے آنا دلھن کو مری تربت پہ میں قربان
حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبرؑ
جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا
کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی

تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں
صحت سے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا
ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانہ
وہ راہ تمھاری ہے تو یہ راہ ہماری

دھڑکا ہے کہ جب ہوں گے عیاں موت کے آثار
یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار
میں ہچکیاں لے لے کے تمھیں یاد کروں گی

گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
دنیا سے کوئی دن میں گزر جائے گی صغرا
عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پُرنم نظر آئی

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے
مریم سے سوا حق نے شرف اُن کو دیئے ہیں

عباسِ علیؑ سے علی اکبر نے کہا تب
پہلے ہوں وہ اسوار تو محمل میں چڑھیں سب
گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنتِ علیؑ ہے

اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
آ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم
تب ہی تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا
چلنے کو ہے اب قافلہ تیار ہمارا
اُٹھے شہِ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
اک مجلسِ ماتم تھی کہ بہم نظر آئی

روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے
آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

ہیں قافلہ سالارِ حرم حضرتِ زینب
حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

پہونچی جہیں ناقے کے قریب دُخترِ حیدرؑ
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے

اک دن تو مہیا تھا یہ سامانِ سواری
محمل تھا نہ ہودج نہ کجاوہ نہ عماری
ننھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دُخترِ زہرا
آنے لگے رہوار کھلا گرد کا پردا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روحِ نبیؐ پر
ہے قبر پہ نانا کی مقدم مجھے جانا
اماّں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا
آخر تو لیئے جاتی ہے تقدیر وطن سے

پیدل شہ دیں روضۂ احمد کو سدھارے
تعویذ سے شبیرؑ لپٹ کر یہ پکارے
خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی
دُکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں ملتی
پابندِ مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں

میں اِک تنِ تنہا ہوں ستمگار ہزاروں
اِک پھول سے کھٹتے ہیں خلش خار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خونریز ہوئے ہیں

خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبرؐ
تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ
نعلینْ اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

اک روز تھا وہ گرد تھے نیزے لیئے ناری
بے پردہ تھی وہ حیدرِ کرّار کی پیاری
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سیدِ والا
عباسؑ سے بولے یہ شہ یثرب و بطحا
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربیؐ پر
کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
اُس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

تربت سے صدا آئی کہ آ اے مرے پیارے
ملتا نہیں آرام نواسے کو تمہارے
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا
راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
ہیں آپ جہاں وہ اصلا نہیں ملتی
خود پاؤں سے اپنے طرفِ قبر چلا ہوں

اِک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اِک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
خنجر مری گردن کے لیئے تیز ہوئے ہیں

فرمائیے اب جائے کدھر آپ کا شبیرؑ
تیغیں ہیں کہیں میرے لیئے اور کہیں زنجیر
بچ جاؤں جو پاس اپنے بلا لیجیئے نانا
یہ کہہ کے ملا قبر سے شہ نے جو رُخِ پاک
جنبش جو ہوئی قبر کو تھرّا گئے افلاک
اُس شور میں آئی یہ صدا روضۂ جد سے
باتوں نے تری دل کو مرے کر دیا مجروح
بے تیغ کیا خنجرِ غم نے ترے مذبوح
افلاکِ امامت کا تجھے بدر نہ سمجھے
مارا گیا جس روز سے شبّر مرا پیارا
اب قتل میں ہوتا ہوں ترے ساتھ دوبارا
زہرا کی جو بستی کو اُجاڑیں تو عجب کیا
اس ذکر پہ رویا کیئے شہ سر کو جھکائے
پایینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
تربت میں جو کی میں نے بہت گریہ و زاری
کہتے تھے کہ اے احمدِ مختار کی پیاری
گھر لُٹتا ہے کیونکر ہمیں چین آئے گا زہرا
میں نے جو کہا قبر سے کیوں نکلے ہو باہر
فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنتِ پیمبر
ترسیں گے وہ پانی کو جو نازوں کے پلے ہیں

یاں قید کی ہے فکر اُدھر قتل کی تدبیر
خونریزی کو کعبہ تلک آ پہونچے ہیں بے پیر
تربت میں نواسے کو چھپا لیجئے نانا
ہلنے لگا صدمے سے مزارِ شہِ لولاک
کانپی جو زمیں صحنِ مقدس میں اُڑی خاک
تم آگے چلو ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے
تو شہر سے جاتا ہے تڑپتی ہے مری روح
ہے کشتیِ اُمت پہ تباہی کہ چلا نوح
بے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے
اُس روز سے ٹکڑے ہے کلیجہ مرا سارا
اُمت نے کیا پاسِ ادب خوب ہمارا
اعدا مجھے تربت سے اکھاڑیں تو عجب کیا
واں سے جو اُٹھے فاطمہؑ کی قبر پہ آئے
آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
پیارے میں اُسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں
گھبرا کے علی آئے نجف سے کئی باری
تم پاس ہو تربت ہے بہت دور ہماری
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسینؑ آئے گا زہراؑ
نہ سر پہ عمامہ ہے نہ ہے دوش پہ چادر
مرنے کو پسر جاتا ہے برباد ہوا گھر
تلواریں ہیں اب اور مرے بچّوں کے گلے ہیں

پھرتا ہے مری آنکھوں میں شبیر کا مقتل
وہ بجلیاں تلواروں کی اور شام کا بادل
شبیر کے سر پر سے یہ آفت نہ ٹلے گی

سُن کر یہ بیاں باپ کا مادر کی زبانی
ہاں والدہ سچ ہے نہ ملے گا مجھے پانی
بچپن میں کیا تھا مرا ماتم شہِ دیں نے

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربتِ شبیر
چلاّئے کہ شبیر کی رخصت ہے برادر
قبریں بھی جدا ہیں تہہ افلاک ہماری

یہ کہہ کے چلے قبرِ حسنؑ سے شہِ مظلوم
یارانِ وطن گرد تھے افسردہ و مغموم
خالی ہوا گھر آج رسولِ عربی کا

جب اُٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم
برپا تھا جنازہ پہ علی کے یوہیں ماتم
بس آج سے بے وارث و والی ہے مدینہ

چلاّتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری
آنکھوں سے یتیموں کے دُرِ اشک تھے جاری
کہتے تھے گدا ہم کو غنی کون کرے گا

تھا ناکے تلک شہر کے اک شورِ قیامت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرنی تھی رخصت
آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے

وہ نہرِ فرات اور کئی کوس کا جنگل
دریا سے وہ پیاسوں کے ہٹا دینے کی ہل چل
دسویں کو محرم کی چھری مجھ پہ چلے گی

رو رو کے پکارا اسد اللہ کا جانی
پیاسے ہیں مرے خون کے یہ ظلم کے بانی
نانا کو خبر دی تھی مری روح امیں نے

اُس قبر سے پلٹے بہ محبّت شہِ صفدر
حضرت کو تو پہلو ہوا امّاں کا میسر
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری

رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبی کا

سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم
تھا رحلتِ شبّر میں محبّوں کو یہی غم
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہے مدینہ

لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری
مضطر تھے اپاہج ضعفا کرتے تھے زاری
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا

سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں اُنھیں دے دیکے کہا شہ نے کہ جاؤ
تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ
پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
اُس بے کس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے
جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
کِس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے
عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے
مکہ نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے
آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علی کے
سب باپ کی خو بو ہے نواسے میں نبی کے

کعبہ میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام
کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
اعدا نے گزرنے نہ دیئے حج کے بھی ایّام
کھولا پسرِ فاطمہؑ نے باندھ کے احرام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
تھی ہشتم ذی حجہ کہ راہی ہوئے حضرت

جاتے تھے دل افسردہ و غمگیں شہِ ابرار
ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار
قبریں نظر آتیں کسی صحرا میں جو دو چار
فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار
جز خاک نہ ہوئے گا نشاں بھی بدنوں کا
انجام یہ ہے ہم سے غریب الوطنوں کا

احباب کہیں، گھر ہی کہیں، آپ کہیں ہیں
آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیرِ زمیں ہیں
خالی ہیں مکاں، آپ تہِ خاک مکیں ہیں
جو دور نہ رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں
حسرت یہی ہوگی کہ پہنچے نہ وطن میں
کیا مُنہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں

باتیں تھیں یہی یاس کی اور درد کی تقریر
منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیر
شب کو کہیں اُترے تو سحر کو ہوئے رہ گیر
جلدی تھی کہ ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر
مقتل کا یہ تھا شوقِ شہِ جن و بشر کو
جس طرح سے ڈھونڈھے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مردِ مسافر جو سرِ راہ　　　یوں پوچھتے تھے اس سے بہ حسرت شہِ ذی جاہ
ایسا کوئی صحرا بھی ہی ای بندۂ اللہ　　　اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ نہ کوئی چاہ
کیا ملتا ہی اس دشت میں اور کیا نہیں ملتا　　　ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبطِ شہِ لولاک　　　ہی سخت پُر اندوہ وہ صحرا تہِ افلاک
ہنستا ہوا واں جاے تو ہو جاتا ہی غمناک　　　سُنتا ہوں وہاں دن کو اُڑاتا ہی کوئی خاک
واں اُنوں کو آتی ہی صدا سینہ زنی کی　　　درویش کی ممکن ہی سکونت نہ غنی کی

چلاتی ہی عورت کوئی ہی ہی مرے فرزند　　　اس دشت میں ہو جائیگا تو خاک کا پیوند
تلواروں سے ٹکڑے یہیں ہوں گے ترے دلبند　　　پانی یہیں ہو جائے گا بچوں پہ ترے بند
پیارے تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گرے گا　　　ہی ہی یہیں خنجر تری گردن پہ پھرے گا

اک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہی دن رات　　　کٹ جائیں گے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات
کیا حال کہوں نہر کا ای شاہِ خوش اوقات　　　پانی تو نہیں شور پہ مشہور ہی یہ بات
طائر بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں پیتے　　　وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے

اُس جا نہ اُترتا ہی نہ دم لیتا ہی رہ گیر　　　ہی شور کہ اس آب میں ہی آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لیئے اس کی ہر اک موج ہی شمشیر　　　اس طرح ہوا چلتی ہی جس طرح چلیں تیر
بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی　　　بو آتی ہی اُس نہر کے پانی میں لہو کی

اُس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم　　　اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اُسے ہم
عاشق پہ بلا بعدِ بلا آتی ہی ہر دم　　　غم اور بڑھا وصل کا عرصہ جو رہا کم
آفت یہ نئی فوجِ شہنشاہ میں آئی　　　مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی

غربت میں نہ ماتم کی سنائے خبر اللہ　　　طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمۂ جانکاہ
گوندھے ہوے سر کھول کے پیٹے حرمِ شاہ　　　فرماتے تھے شہ سب کو ہی درپیش یہی راہ
ہوگا وہی اللہ کو جو مدِّ نظر ہی　　　آج اُن کا ہوا کوچ کل اپنا بھی سفر ہی

وارث کے لئے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال
محمل سے گری پڑتی تھی بکھرائے ہوئے بال
روتے تھے بہن کے لئے عباس خوش اقبال
وہ کہتی تھی ساتھ آئے تھے چھوٹے مرے دو لال
پوچھو تو کدھر وہ مرے پیارے گئے دونو
فرماتے تھے شبیر کہ مارے گئے دونو

محمل تھے سب اُس بی بی کے ہودج کے برابر
تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبیر کی خواہر
گھبرا گئی تھی مسلم مظلوم کی دُختر
ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر
کیوں پیٹتی ہو کون جدا ہو گیا امّاں
غربت میں مرے باپ پہ کیا ہو گیا امّاں

اس دن سے تو اک برسرِ ستم فوج پہ چھایا
کھانا کئی دن قافلے والوں نے نہ کھایا
رستے میں ابھی تھا اسد اللہ کا جایا
جو چاند محرم کا فلک پر نظر آیا
سب نے مہِ نو لشکرِ شبیر میں دیکھا
مُنہ شاہ نے آئینۂ شمشیر میں دیکھا

خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے
مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے
یہ چاند مبارک ہو یداللہ کے جائے
کفّار پہ تو فتح اسی چاند میں پائے
رُتبہ مہ و خورشید سے بالا ہے تیرا
تا حشر زمانے میں اُجالا رہے تیرا

حضرت نے دُعا پڑھ کے یہ کی حق سے مناجات
کر رحم گنہگاروں پہ اے قاضی حاجات
سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے تری ذات
خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات
باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دس دن تری طاعت میں بسر ہوں

پہونچا دے مجھے جلد بس اے خالقِ افلاک
اُس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری خاک
طالب ہے ترے قرب کا سبطِ شہِ لولاک
نہ ملک کی خواہش ہے نہ درکار ہے املاک
بیتاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجھ کو

اتنے میں یہ فضّہ علی اکبرؑ کو پکاری
لو دیکھ چکیں چاند یداللہ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری
آنکھوں کو کئے بند یہ فرماتی ہیں واری
آئیے تو رُخِ اکبرِ ذی قدر کو دیکھوں
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

شہ داخلِ خیمہ ہوے فرزند کے ہمراہ
یہ چاند ہی کس طرح کا اے فاطمہ کے ماہ
سر تن سے مرا اس مہِ پُرغم میں کٹے گا
یہ آلِ نبی کی ہے مصیبت کا مہینا
پہونچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینا
یہ بارِ امانت مری گردن سے اُتر جاے

گردوں پہ مہِ نو جو نمایاں ہے یہ ہمشیر
اس چاند میں کٹ جاے گا سب لشکرِ شبیر
برچھی کسی جانباز کے پہلو میں لگے گی
خیمے کو جلا دیں گے لٹے گا زر و زیور
ماؤں سے پسر چھوٹیں گے بہنوں سے برادر
گھڑکیں گے ستمگار جو رووے گی سکینہ

دولہ کوئی ٹاپوں کے تلے ہوئیگا پامال
تیروں سے کسی ماں کا جگر ہووے گا غربال
معصوموں کے سونے کی جگہ پائیں گی خالی
اس عشرۂ اول میں نہ ہوئیں گے بہن ہم
عشرہ یہ وہ عشرہ ہے کہ اے زینبِ پُرغم
دیکھو گی نہ پھر منہ علی اکبرِ سے پسر کا

رونے کے لیئے حق نے بنائے ہیں یہ دس دن
لیویں گے مرا تعزیہ ہر شہر کے ساکن
بھولیں ہمیں ایسے نہیں غمخوار ہمارے

منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنتِ یداللہ
فرمانے لگے رو کے بہن سے شہِ ذیجاہ
زینب یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا
یہ ظلم کا عشرہ ہے یہ آفت کا مہینا
آخر ہے بس اب عمر کی مدّت کا مہینا
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اتر جاے

چڑھتی ہے مرے سر کے لئے چرخ پہ شمشیر
نیزہ کوئی کھاے گا کلیجے پہ کوئی تیر
شمشیر کسی شیر کے بازو میں لگے گی
اس ماہ میں ہوں گے نہ پدر اور نہ برادر
بیوہ کئی سیدانیاں ہوویں گی مقرر
اس ماہ میں بے باپ کی ہووے گی سکینہ

پیٹے گی کوئی تازہ دُلھن کھولے ہوئے بال
نکلے گی کوئی کہتی ہوئی ہاے مرا لال
بچوّں سے بھری گودیاں ہو جائیں گی خالی
تاریخ سفر ہے دہم ماہِ محرم
جس لال کی عاشق ہو وہ ہو جاے گا بیدم
اب شام میں ہوے گا تمھیں چاند صفر کا

ان روزوں خوشی ہو کسی کو نہیں ممکن
اکبر کو جواں روئیں گے معصوموں کو محسن
ہوئیں گے سیہ پوش عزادار ہمارے

غش ہوگئی سن کر یہ بیاں زینبِ پُر غم
خیمے میں اُسی رات سے برپا ہوا ماتم
بیدار رہیں صبح تلک بی بیاں باہم
خیموں کو اُکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم
آخر وہی صحرا وہی جنگل نظر آیا
تھی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

اُترے اسی میدانِ بلاخیز میں سرور
استادہ ہوئے خیمۂ ناموسِ پیمبرؐ
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبر
دریا پہ ٹہلنے لگے عباسِ دلاور
شہ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی
ہاں شیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

خامے کو بس اب روک انیسِ جگر افگار
خالق سے دعا مانگ کہ اے ایزدِ غفار
زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار
غیر از غمِ شہ اُن کو نہ غم ہو کوئی زنہار
آنکھوں سے مزارِ شہ دلگیر کو دیکھیں
اس سال میں سب روضۂ شبیر کو دیکھیں

رباعی

جس دن کہ فراقِ روح و تن میں ہوگا
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رختِ نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

رُباعی

مرقد میں انیسؔ نہ کفن میں ہوگا
وہ روضۂ سلطانِ زمن میں ہوگا
چل کر گلزارِ کربلا میں ڈھونڈیں
بلبل کا مزار بھی چمن میں ہوگا

مرثیہ (۳۱)

سبطِ نبیؐ سے منزلِ مقصد قریب ہی — آرام گاہِ جانِ محمدؐ قریب ہی
مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہی — جس جا لحد بنے گی وہ سرحد قریب ہی
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو — آئی ہی کربلا سے اجل پیشوائی کو

ہی شور آمد آمدِ شاہ فلک سریر — فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہی بھیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لیئے شریر — حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں — دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شُقّے گئے ہیں شام کے حاکم کے جابجا — ہر پرگنے سے ہی طلبِ لشکرِ جفا
آکر اُترتی جاتی ہیں فوجیں جدا جدا — لیتا ہی جائزہ عمرِ سعدِ بے حیا
غل ہی کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو — انعام میں ملے گا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار — ہی جابجا درستیِ اسبابِ کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار — خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر — پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

وہ سالکِ طریقِ ہدایت ہی شاد شاد — ہی آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مراد
بہتے ہیں اشک جوش پہ ہی بحرِ اتحاد — لب پر اُسی کا ذکر ہی دل میں اُسی کی یاد
معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں — یہ شوقِ وصل ہی کہ کسی کی خبر نہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت — سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں — توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

چلتی ہے لوں حرارت خورشید ہے دو چند
جھیلوں میں ہیں درند درختوں پہ ہیں پرند
غربت میں بیکسی ہے شہِ دیں پناہ پر
وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار
کیونکر یہ دُکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
چلّاتی ہے سکینہ کہ اے مرے چچا
بابا سے کہدو اب کریں خیمہ کہیں بپا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے

جب طے ہوئی وہ منزلِ آفت قریبِ شام
اکبر نے آن کر کیا پردے کا اہتمام
ڈوبے ہوئے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
اُترے رفیق خاص قریبِ خیامِ شاہ
نکلا حرم سے حضرتِ خیر النسا کا ماہ
ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہو گیا

اُس دن بہت اُداس تھا زہرا کا یادگار
صحرا پہ گہہ نظر تھی گہے سوے کوہسار
کس کو نہ بے وطن کیا کس پر جفا نہ کی

مُرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہے یہ گزند
ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
گیسوے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیر خوار
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

اس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام
ناقوں سے اُترے آلِ نبی باصد احترام
دل بندھ گئے تھے چاند سے چہرے اُداس تھے
کچھ فاصلے سے گرد فروکش ہوئی سپاہ
کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

زردی تھی رُخ پہ گیسوؤں پر راہ کا غبار
کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہِ دیں کہ ناگہاں
عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہ دو جہاں
تشویش ہی رسولِ خدا کے حبیب کو
جلدی چلے یہ سنتے ہی حکمِ شہِ انام
ناقہ بٹھا کے کود پڑا تب وہ نیک نام
آیا ہی تو جدھر سے اُدھر ہم بھی جاتے ہیں

دیکھا جو رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
ہی کون شخص آپ کا آقائے خوش خصال
نورِ نگاہِ فاتحِ بدر و حُنین ہی
یہ سُن کے اشک آنکھوں سے اُس شخص نے بہائے
کیوں اس طرف کو سیدِ والا وطن سے آئے
سب اہل شہر ہیں کوفیوں کو اُن سے بیر ہی

گھبرا گئے یہ سُنتے ہی عباسِؑ باوفا
مسلم نے بھی یہ حال تو خط میں نہیں لکھا
سب شہر پھر گیا ہی شہِ خاص و عام سے
پہونچا وہ جب قریبِ شہنشاہ سرفراز
ہاتھ اُس کا لیکے ہاتھ میں اُٹھے شہِ حجاز
گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہی

کی عرض اُس نے اے پسرِ سیدِ البشر
فرمایا شہ نے ہی تجھے مسلم کی کچھ خبر
شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہی

ناقے پہ ایک شخص ہوا دور سے عیاں
تم جا کے اس عرب کو بُلا لاؤ بھائی جاں
کچھ پوچھنا ہی اُس سے حسین غریب کو
پاس اُس کے جا کے آپ نے کی سبقتِ سلام
عباس نامور نے یہ اُس سے کیا کلام
اے شخص جلد چل تجھے آقا بلاتے ہیں

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس نے کیا سوال
عباس نے کہا کہ رسولِ خدا کا لال
آقا کا میرے اسمِ مبارک حسین ہی
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولا کہ ہائے ہائے
آفت سے نورِ چشمِ علی کو خدا بچائے
پھر جائیں آپ جانبِ یثرب تو خیر ہی

فرمایا اے عرب ترے رونے کی وجہ کیا
اُس نے کہا کہ اور ہی کچھ واں کا ماجرا
کہنا ہی جو کہوں گا مفصل امام سے
تسلیم کر کے پاؤں پہ رکھا سرِ نیاز
بولا کنارے جا کے وہ امت کا کارساز
آنا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہی

کوفے کے شہرِ شوم سے آتا ہوں میں ادھر
رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر
جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہی

گھبرا کے حال پوچھتے تھے شاہِ نامدار
گر گر گئے وہ قدم پہ یہ کہتا تھا بار بار
پھر چلیئے اب وطن کی طرف بہرِ کردگار
کوفے میں سب ہیں عہد شکن اور ستم شعار
آلِ رسولِ پاک پہ کیا کیا جفا نہ کی
یہ ہیں وہی جنھوں نے علی سے وفا نہ کی

ہاتوں کو جوڑتا ہوں میں شاہا نہ جائیے
بہرِ علی و احمد و زہرا نہ جائیے
اُس جا دغا ہی سیّدِ والا نہ جائیے
آقا نہ جائیے مرے مولا نہ جائیے
کیا دور ہی جو آکے عدو سدِّ راہ ہوں
ایسا نہ ہو کہ آلِ محمّد تباہ ہوں

بچوں پہ رحم کیجیے یا شاہ انس و جاں
پہونچے نہ ان گلوں کو کہیں صدمۂ خزاں
بچھڑے نہ اس ضعیفی میں اکبر سا نوجواں
رکھّے خدا جہان میں یدُاللہ کا نشاں
پھولا پھلا رسولِ خدا کا چمن رہے
روشن سدا چراغِ مزارِ حسن رہے

یہ فکر ہی جو آپ کو لکھّے ہیں سب نے خط
مطلب یہ ہی کہ یاں تلک آویں کسی نمط
مضمون بھی غلط ہیں عبارت بھی سب غلط
یہ خط نہیں ہیں قتل کی تدبیر ہی فقط
حاکم کا مدعا ہی کہ ظلم و ستم کروں
گر جھوٹ ہو تو ہاتھوں کو اپنے قلم کروں

کوفی تمام مایۂ جور فساد ہیں
مفسد ہیں بد طریق ہیں بد اعتقاد ہیں
تربت میں فاطمہؓ کے رُلانے پہ شاد ہیں
تیغیں ادھر ہیں دل سوے ابنِ زیاد ہیں
بے ہمتوں نے کونسا وعدہ وفا کیا
کیونکر کہوں کہ مسلمِ بیکس سے کیا کیا

پھر بولا سر کو پیٹ کے با صد غم و محن
آقا ہوا شہید وہ مظلومِ بے وطن
نیزے پہ سر ہی جسم ہی بے گور و بے کفن
اور اب تلک بندھی ہوئی ہی پاؤں میں رسن
تربت نہیں نصیب تنِ پاش پاش کو
گلیوں میں لوگ کھینچتے پھرتے ہیں لاش کو

باقی جو تھا حضور کا غم خوار و خیر خواہ
مسلم نے لی تھی گھر میں اُسی دوست کے پناہ
کوڑے لگے پہ منہ سے نہ کی اُس جری نے آہ
مسلم کے ساتھ وہ بھی ہوا قتل بے گناہ
صادق جو تھے وفا میں تو کامل تھے عشق میں
دونوں کے سر روانہ ہوئے ہیں دمشق میں

شہ نے سنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا
جو مسلمِ غریب پہ ہونا تھا ہو چکا
خواہانِ مرگ سبطِ رسالت مآب ہے

یہ بات کہہ کے رونے لگے شاہِ نامدار
فرماتے تھے کہ ہائے مرے یارِ غمگسار
میں جانتا تھا اب مرے لینے کو آؤ گے

دوڑے ہوئے جب آئے تم اس شہر کے قریب
پردیس میں لحد بھی نہ تم کو ہوئی نصیب
تکتے تھے مجھ کو یاس سے منہ پھیر پھیر کے

کوفی بدی کریں گے یہ مجھ کو نہ تھی خبر
درپیش ہے ہمیں بھی اسی طرح کا سفر
رُتبے بڑے ہیں کشتۂ اول کے واسطے

اتنے میں روتے روتے جو کچھ آگیا خیال
اُس نے کہا کہ کیا کہوں اے شاہِ خوش خصال
بے رحم نے یتیموں پہ کیا کیا ستم کیے

آتا تھا شہر کوفہ سے جس دم میں نوحہ گر
آنکھیں کھلی تھیں چاند سے چہرے تھے خوں میں تر
ماتھوں سے آشکار نشانِ سجود تھے

فریاد کر کے کہنے لگے سرورِ عرب
بندوں کا اختیار ہے کیا جو رضائے رب
معلوم تھا کسے کہ تباہی یہ آئے گی

فرمایا بازگشت ہے سب کی سوئے خدا
باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئے گا
اُن کا جہاں سے کوچ مرا پا تراب ہے

وا مسلما کہا کئی باری بحالِ زار
بھائی حسین تیری غریبی پہ ہو نثار
اس کی خبر نہ تھی کہ ہمیں چھوڑ جاؤ گے

مارے گئے وہاں کوئی جس جا نہ تھا حبیب
کیسا سفر تھا ہائے مرے قاصدِ غریب
کوفے میں لے گئی تھی اجل تم کو گھیر کے

شرمندہ ہے حسین تمھیں پہلے بھیج کر
اب ہم بھی آن پہونچے ہیں واں تم گئے جدھر
سبقت تو ہے ضرور ہر اول کے واسطے

مسلم کے دونوں بیٹوں کا پوچھا عرب سے حال
حارث کے ہاتھ آگئے وہ دونوں نونہال
بازو بندھے تھے دونوں کے جب سر قلم کیے

حاکم کے آگے جاتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے سر
رُخ پہ پڑی لٹکتی تھیں زلفیں ادھر اُدھر
بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

خاموش رہ کہ صبر کی طاقت نہیں ہے اب
دونوں یتیم بھی نہ بچے اُس کے ہے غضب
ماں اُن کی جب سنے گی تو کیا خاک اُڑائے گی

رو رو کے پوچھا بچوں کی قبروں کا جب پتا
کی عرض کچھ نہ پوچھیے ای ابنِ مرتضا
یوں دفن کم ہوا ہی کوئی کائنات میں
یہ سُن کے اُٹھ کھڑے ہوے حضرت بچشمِ نم
اب کس طرف کا قصد ہی ای سرورِ اُمم
مُنہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جاے گا
رخصت ہوا وہ مردِ مسافر بصد فغاں
آنکھوں سے اشک ریشِ مبارک پہ تھے رواں
صدمے سے رنگ بانوے بیکس کا فق ہوا
کلثوم سر کو پیٹ کے آئی بہن کے پاس
تکتی تھی منہ کو شہ کے سکینہ بچشمِ یاس
خیمے سے صحن تک جو گئی جا بجا گری
رونے سے شہ کے ہوش کسی کے نہ تھے بجا
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ باوفا
پوچھوں تو حال کیوں شہِ والا کا غیر ہی
کبرا پکارتی تھی کہ صغرا کی خیر ہو
مسلم کی بیٹی کہتی تھی بابا کی خیر ہو
ہی ہی وطن سے آن کے وہ لٹ گئے نہ ہوں
کہتی کبھی سکینہ سے رو کر وہ بے قرار
وجہ بکا تو پوچھو بہن تم پہ ہیں نثار
پڑتا ہی دل میں شک مری چھاتی دھڑکتی ہی

وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا
تجہیز کیسی قبر کجا اور کفن کجا
خندق میں لاش باپ کی بیٹے فرات میں
کہنے لگا وہ مردِ عرب چوم کر قدم
شہ نے کہا کہ جائیں گے مقتل پہ اپنے ہم
مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جاے گا
نہوڑا کے سر کو گھر میں گئے شاہِ دوجہاں
حضرت کو روتے دیکھ کے گھبرائیں بی بیاں
زینب زمیں پہ اٹھ کے گری پر قلق ہوا
قاسم کی والدہ میں نہ مطلق رہے حواس
سب سے زیادہ زوجۂ مسلم کو تھا ہراس
چہرے سے رنگ اُڑ گیا سر سے ردا گری
سینوں میں دل دھڑکتے تھے لرزاں تھے دست و پا
باہر سے یاں اُنھیں تو بلاے کوئی ذرا
کیا ہو گیا وطن میں تو لوگوں کی خیر ہی
یا رب مریضِ بیکس و تنہا کی خیر ہو
غربت میں قاصدِ شہِ والا کی خیر ہو
بھائی مرے پدر سے کہیں چھٹ گئے نہ ہوں
ہی دل میں شہ کے سب سے زیادہ تمھارا پیار
حضرت تمھی کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار
رہ رہ کے غم کی آگ جگر میں بھڑکتی ہی

اتنے میں بڑھ کے شاہ سے زینب نے یہ کہا
فرمایا شاہ نے کہ بہن قہر ہوگیا
مسلم سے کوفیوں نے بڑی بے وفائی کی
پیٹو کہ رانڈ ہوگئی عباسؑ کی بہن
مارا گیا مرے لئے ہے ہے وہ صف شکن
آپہونچی فصل فاطمہ کے خاک اُڑانے کی
سمجھو تم اس خبر کو مرے قتل کی خبر
پُرسے کو آئے زوجۂ عباسِؑ نامور
رنڈسالہ بی بیاں اُسے جس دم پنہائنگی
کہدو سکینہؑ دُخترِ مسلم کے پاس جائے
کبرا برابر اُس کے زمیں پر پچھاڑیں کھائے
ہم بھی خدا کی راہ میں اب قتل ہوئیں گے
یہ سُن کے چھاتیوں کو لگے پیٹنے حرم
مارا گیا سفر میں غلام شہِ امم
صدمے اجل کے تین دموں پر گزر گئے
غل سُن کے آئے خیمے میں عباسؑ نامور
دل غم سے ٹکڑے ہوگیا روئے جھکا کے سر
سمجھیں گے اُن سے قاتل مسلم نظر میں ہیں
وابستہ جس کے دم سے ہو اس کا رہے خیال
ہم سب غلام جس کے ہیں دیکھو تو اُن کا حال
لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
بھیّا مجھے بتاؤ تو رونے کی وجہ کیا
بیٹوں سمیت قتل ہوا ابنِ عم مرا
گاڑی نہ لاش بھی مرے مظلوم بھائی کی
رنڈسالہ اس کو دو کہ نہ اُس کو ملا کفن
اب ہم نہ پھر کے جائیں گے ہم سے چھٹا وطن
زینب یہ ابتدا ہے مرے مارے جانے کی
بانو بھی ساتھ زوجۂ مسلم کے کھولے سر
بیکس تھا وہ شریک عزا ہو تمام گھر
اماں تکل کے قبر سے پُرسے کو آئیں گی
چھاتی کو جب وہ پیٹے تو یہ سر پہ خاک اُڑائے
باپ اُس کا مر گیا ہے گلے سے اُسے لگائے
اک دن اسی طرح ہمیں سب مل کے روئیں گے
چلائی رو کے زوجۂ مسلمؑ کہ ہے ستم
فریاد ہے کہ رانڈ ہوئی میں اسیرِ غم
وارث بھی مر گیا مرے بچّے بھی مر گئے
دیکھا بہن تڑپتی ہے سر ننگے خاک پر
بولے قریب آکے خدا پر کرو نظر
پیٹو نہ سر کہ سیدِ والا سفر میں ہیں
لازم نہیں تمھیں کہ بھرے گھر میں کھولو بال
مانگو دُعا جہاں میں رہے فاطمہؑ کا لال
اُس کا زہے شرف کہ نثارِ امام ہو

مسلم ہوئے ہراولِ فوجِ شہِ انام ۔ دنیا میں تا قیامِ قیامت رہے گا نام
کیا نیک کوچ تھا کہ ہوا خلد میں مقام ۔ مخدومۂ جہاں انھیں روویں گی صبح و شام
ماں سے سوا شفیق ہیں اور حق شناس ہیں
بچے تمھارے فاطمہ زہرا کے پاس ہیں

شوہر تمھارا صاحبِ عزت تھا اے بہن ۔ حلّے ملے بہشت میں پایا نہ گر کفن
زخموں کے بدلے ہاتھ لگا خلد کا چمن ۔ ہمسایۂ رسولؐ ملا گو چھٹا وطن
راضی علی ہوں شاد خدا کا حبیب ہو
مانگو دعا کہ ہم کو یہ دولت نصیب ہو

مسلم کا خوں جو راہِ خدا میں ہوا سبیل ۔ پہونچا کنارِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
تائیدِ ذوالجلال سے رتبہ ہوا جلیل ۔ عاقل کمال تھا پسرِ حضرتِ عقیل
سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا
زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مر گیا

سمجھاتے تھے بہن کو یہ عباسِ نامور ۔ روتے تھے سر جھکائے ہوئے شاہِ بحر و بر
مسلم کو یاد کر کے حرم پیٹتے تھے سر ۔ بیٹی پکارتی تھی کہ ہے ہے مرے پدر
تم بن ہماری زیست کی صورت بگڑ گئی
بیٹوں کو ساتھ لے گئے بیٹی بچھڑ گئی

شورِ بکا ذرا نہ ہوا کم تمام رات ۔ سویا نہ کوئی خیمے میں اک دم تمام رات
تڑپا کیے امامِ دو عالم تمام رات ۔ گھر میں رہا حسین کے ماتم تمام رات
بس اے انیس اب نہیں لکھنے کی تاب ہے
اس آتشِ الم سے کلیجہ کباب ہے

مرثیہ (۴)

جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا
سر جھک گیا فلک کا یہ اوجِ زمیں ہوا
پایا فروغ نیّرِ دیں کے ظہور سے
زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی
سب ارضِ پاک غیرتِ باغِ جناں ہوئی
دامن جو پاک صاف تھا دشتِ مصاف کا
ہاتف نے دی صدا کہ زہے شانِ کربلا
پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا
خورشیدِ دیں کے فیض سے کیا کیا شرف ملے
یہ دشتِ ہولناک کہاں یہ چمن کہاں
کنبہ کہاں نبیؐ کا یہ دارِ محن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
غل تھا چمن چمن کہ بہار آئی اب قریب
بولی یہ آشیاں سے جدا ہو کے عندلیب
فخر اُس زمیں کا جس پہ شہِ انس و جن پھرے
خوشبو سے اُن گلوں کی ہوا دشت باغ باغ
پہونچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے

دشتِ بلا نمونۂ خلدِ بریں ہوا
خورشید محوِ حسنِ حُسینِ حسیں ہوا
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے
غازی جہاں چلے وہ زمیں کہکشاں ہوئی
ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی
احرام باندھا کعبہ نے اُس کے طواف کا
مختارِ کائنات ہی مہمانِ کربلا
بس اب فواں بہشت ہی بستانِ کربلا
روشن ہی جس سے عرش وہ درِّ نجف ملے
جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں
قبریں کہاں شکستہ دلوں کی وطن کہاں
سچ ہی کہ خاک کھینچتی ہی اپنی خاک کو
باغی جو چین دیں تو یہ ہی موسمِ عجیب
آیا گلِ ریاضِ محمدؐ خوشا نصیب
دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے
غنچے کھلے ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
تاروں کو گرد کر دیا ذرّوں نے خاک کے

جنگل ہیں بن گیا شجرِ طور ہر درخت
آئی صدا فلک سے کہ جاگے زمیں کے بخت
رفعت کا اُس کی فرش سے غل عرش تک گیا
کہتی تھی آسماں سے زمینِ فلک حشم
مجھ پر ہیں وہ جو مُہرِ نبوت پہ تھے قدم
اب تو یہ خاکسار بھی کیواں اساس ہے
پھیلی جو نکہتِ چمنِ شاہِ بحر و بر
جلدی ہوا نے جاکے یہ دریا کو دی خبر
جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما اب امامِ دہر
یہ سُن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر
آمد سُنی جو سبطِ رسالت مآب کی
بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
اُترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام
مقتل یہی زمین ہے یہی مشہدِ امام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
مثلِ زمینِ خلد مُصَفّا ہے یہ زمیں
روئے زمیں پہ عرشِ معلیٰ ہے یہ زمیں
اس کے مکیں ہوں گے پراگندہ حشر میں

بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت
اب اس زمیں پہ سوئے گا مختارِ تاج و تخت
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا
کیوں آج مرتبے میں زیادہ ہو تو کہ ہم
ذرّے سے بھی یہاں ترے شمس و قمر ہیں کم
زیور جو عرش کا تھا وہ سب میرے پاس ہے
صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بسر
آیا تری کچھار میں مختارِ خشک و تر
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے
دریا دلی کا ہوگا ترے شور شہر شہر
سر کو قدم کئے ہوئے دوڑی ہر اک لہر
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی
منزل پہ ہم پہونچ گئے احسانِ کردگار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لئے دل تھا بے قرار
پایا دُرِ مُراد بڑی خاک چھان کے
کوچ اب نہ ہوگا حشر تلک ہے یہیں مقام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر
ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا ہے یہ زمیں
بے سر اسی زمیں سے ہم اُٹھیں گے حشر میں

مرغوب طبع ہی یہ زمینِ فلک جناب
سوئے گا اس کی خاک پہ فرزندِ بوتراب
ہی اس طرح یہ ساری زمینوں میں انتخاب
جس طرح ذی شرف ہی ستاروں میں آفتاب
مرنا لکھا ہوا ہی یہیں سرنوشت میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

سجدے کریں گے جس پہ ملک وہ زمیں یہ ہی
جس پر کھدا ہی نقشِ شفا وہ نگیں یہ ہی
بطحا یہ ہی مدینۂ اربابِ دیں یہ ہی
کعبہ یہ ہی نجف یہ ہی خلدِ بریں یہ ہی
تھی اس زمین کی قدر رسولانِ پاک کو
آنکھوں سے سب لگا گئے ہیں یاں کی خاک کو

ذرّوں سے اس کے اشرفیِ مہر زرد ہی
مٹی طلا ہی نسخۂ اکسیر گرد ہی
کردے سقر کی آگ کو پانی یہ سرد ہی
کحلِ بصر ہی داروے اندوہ و درد ہی
زندے الم سے بچتے ہیں مردے فشار سے
آنکھوں میں نور آتا ہی اس کے غبار سے

خاک اس کے دل میں ہو جسے اس خاک سے غبار
مجرم بھی اس کے فیض سے اُٹھے گا رستگار
پڑ جائے جس کے جسم پہ خاک اس کی ایک بار
سایہ سے اُس کے آتشِ دوزخ کرے فرار
یوں دور ہوں گناہ سب اُس نیک بخت سے
پتے خزاں میں گرتے ہیں جیسے درخت سے

کام آئے گی لحد میں یہ ہنگامِ درد و یاس
اس خاک سے بنے گا کفنِ نور کا لباس
تسبیح اس کی قبر میں ہوے گی جس کے پاس
سو سو طرح کی پائے گا راحت وہ حق شناس
فرمائیں گے ملک ارم اس کا مقام ہی
سوئے گا وہ چین سے یہ مطیعِ امام ہی

دیں گے جو اس کی خاک سے لکھا ہوا کفن
میّت پہ پھر نہ ہو گا کوئی صدمہ و محن
ڈھانپے گا اُس کو چادرِ رحمت سے ذوالمنن
خوشبو سے ہو گا کنجِ لحد خلد کا چمن
پھولوں میں خاکِ پاک کفن کو بسائے گی
صُرّوں سے نکہتِ گلِ فردوس آئے گی

توشہ مسافروں کا یہی اور یہی ہی زاد
یہ خاک آبِ خضر سے رتبے میں ہی زیاد
طوفاں میں اس کو ڈالے گا جو مردِ خوش نہاد
لے آئے گی ہوائے موافق دُرِ مُراد
دیکھے گا یاس میں کرمِ کارساز کو
تھامے گا دستِ موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند
سیراب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
گرمی میں ایسی سرد ہوا یا شہِ انام
مشہور غاضریہ ہے شاید اسی کا نام
ایسی جگہ بس اب نہ ملے گی کسی جگہ
روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام
زلفیں ہوا سے اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال
سبزے سے وہ اُن کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال
ای خسروِ زمیں یہ جگہ ہے جلوس کی
صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ امم
اُبھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہ رو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو
کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر

جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر
کیوں یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے
ہے لیٹنے کی جا یہ زمینِ فلک مقام
جی چاہتا ہے یاں سے سرکیے نہ ایک گام
کیا لطف ہے جو قبر بھی ہووے اسی جگہ
گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے
پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال
کی عرض اس نے بن کا ہر اک گل ہے بے مثال
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی
الیاس شاد ہو کے پکارے زہے حشم
بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے
دھویا کسی نے رخ کسی نے کیا وضو
بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیک خو
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور
ایذا ہی محملوں میں بہت اہلِ بیت پر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسؑ با وفا
حاضر ہی جاں نثار امامِ غیور کا

بولی بہن کے دخترِ خاتونِ روزگار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو

عاقل ہو تم تو نامِ خدا ای علی کے لال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال
گوشہ ملے ہمیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہی گھر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہی آسماں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے

بھائی سے اس زمیں کی سنی ہی بہت صفت
جو جو سخن ہیں اُن سے کھلی لازم ہی مصلحت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو

خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوے

زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
جا کر قریبِ محملِ زینبؓ یہ دی صدا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہیں نثار
ہر جا مسافروں کا نگہباں ہی کردگار
اُترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہی خیال
واری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال
اب تو یہی پڑی ہی کہ جانوں کی خیر ہو

کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوے بسر
دن بھر جلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
ایک ایک کوس راہ جبل ہیں پہاڑ تھا

اب دیکھیئے دکھاتی ہی تقدیر کیا یہاں
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

ہی وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
بھیّا مجھے یہ ڈر ہی کہ رد و بدل نہ ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
ہرچند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
جو مہرِ فاطمہ میں ہی یہ وہ فرات ہی
جس سرزمیں پہ دلبرِ زہرا عمل کرے
مانع وہ ہو جو دینِ نبیؐ میں خلل کرے
دخل اس میں روم کا ہی نہ سلطانِ شام کا
حضرت کے حکم کا مترصد ہی جاں نثار
آیا حضورِ سبطِ پیمبرؐ وہ ذی وقار
اُتریں یہیں یہ مرضیٔ آلِ رسولؐ ہی
یہ سُن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں
جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
بولے زہیرِ قیں کہ حاضر ہیں سب غلام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام
پرتو فگن تھا نورِ رسالت مآب کا
تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
مُڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہی
یک جا ہوے یہ سُن کے جوانانِ صف شکن
آئے ہیں ملکِ غیر میں ہم چھوڑ کر وطن
اعدائے دیں کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں

تشویش کچھ نہ کیجیے ای بنتِ مرتضیٰ
لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہی جا
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہی
زہرہ کسی کا کیا ہی جو رد و بدل کرے
کافر ہی جو حسین سے جنگ و جدل کرے
دنیا کی سب زمیں پہ ہی قبضہ امام کا
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہی خاکسار
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہی
فرّاش آ کے جلد مصفّا کریں زمیں
یاں ہوگا خیمۂ حرمِ بادشاہِ دیں
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے
بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروفِ اہتمام
رُتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرشِ احتشام
سر پر لگا تھا چترِ زری آفتاب کا
کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسِ ذی وقار
رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہی
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن
تو سب کی خبر کیجیو ای ربِ ذوالمنن
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

کہنے لگے پکار کے عباسِ حق شناس
ہاں ناصرانِ قبلۂ کونین با حواس
دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلامِ یاس
جیتے ہو تو حسین سے ہو قدرداں کے پاس
گرم گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
دونوں طرف تو آل تمھارا بخیر ہے

کیا ڈر فشونِ روم ہے یہ یا جنودِ شام
ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام
جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام
ہونے دو گر ہیں سرخ علم یا سیاہ فام
سرسبز ہیں وہی جو علی کے نشان ہیں
خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہمان ہیں

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھپ گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ایک ایک ہیل زورِ تہمتن شکوہ تھا
ابنِ رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسِ باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا
کہدو کہ اہلِ بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے لختِ دلِ سید البشر
آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑکے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
حکمِ امیر ہے یہیں اُتریں سپاہِ شام
چھوڑیں گے ہم اُسے کہ جو راحت کا ہے مقام
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام
لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

کوفے سے کل جواں ادھر آئے ہیں دس ہزار
رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ملے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
دشتوں کی روم و شام کے آمد ہی روز و شب
کیجے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر

سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر
کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیرِ برق دم
گر فوج قاہرہ کی ہی آمد تو کیا ہی غم

بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
دنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں
گیتی ہو بے نشاں اگر آئیں جلال میں
دریا ہی کیا یہ شیر ہٹیں جس کو چھوڑ کے

تم کون ہو حسینؑ ہی مختارِ خشک و تر
دیکھو فساد ہو گا بڑھو گے اگر ادھر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
دریا تو ابتدا سے ہمارا ہی تم ہو کون؟

اللہ نے زمیں کو سنوارا ہی تم ہو کون؟
ہیہات غصبِ حق سے پھرے آج تک نہیں
کیا ابنِ سعد شوم کی فوج اور کیا حشم
اترے ہیں آ کے فخرِ سلیماں کے ساتھ ہم

کچھ ڈر نہیں چھ لاکھ اگر بدخصال ہیں
گرد ے میں ہیں کوس کے لشکر پڑا تھا سب
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہی آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم

گرتا ہی کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
یہ آنکھ وہ ہی جس میں سماتا نہیں کوئی
لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہی جدال میں
ہی سب طرح کا نور محمدؐ کی آل میں

جب پل بنا دیا درِ خیبر کو توڑ کے
ان کے سوا ہی کون شہنشاہِ بحر و بر
شیروں کا یاں عمل ہی تمھیں کیا نہیں خبر
بس کہدیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

اس کا محق رسول کا پیارا ہی تم ہو کون؟
ساحل پہ کچھ کسی کا اجارا ہی تم ہو کون؟
منزل مسافروں کی یہ ہی کچھ فدک نہیں
سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم

کیا ان کے ہو رہے کہ جو ہوں چیونٹیوں سے کم
ہم بھی کنندۂ درِ خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہی بس سامنے سے جاؤ
دعویٰ ہی کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ
تلوار ادھر کھچی کہ ادھر کھیت پڑ گیا
ہم شیر ہیں قسم اسدِ کردگار کی
سُنو کی نہ اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی
گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
چھوڑیں نہ یہ زمین جو گرے سر پہ آسمان
جب تک کہ دم میں دم ہی نہ جائے آن بان
مر جائیں وہ جو ساتھ کئی شیر خوار ہیں
ہم پہلے آئے ہیں کہ تم آئے ہو تا بہ نہر
چھوڑ آئے ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر
اُترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
شراس قدر زمیں پہ تمھارے سروں پہ خاک
ہی بوترابیوں کی جگہ یہ زمینِ پاک
تم لوگے کس طرح یہ جگہ ہم کو بھائی ہی
سوچو تمھیں دلوں میں کہ حق دار کون ہی
ہادی ہی کون سیدِ ابرار کون ہی
لازم ہی تم کو پاس کلامِ مجید کا
یہ کس کے گھر سے دین کی دولت ملی تمھیں
خوانِ کرم سے کس کے یہ نعمت ملی تمھیں
پھلتا نہیں نہالِ حسد پھولتا نہیں

فوجوں کا ذکر کرکے کسی اور کو ڈراؤ
بیٹا رحیم کا ہوں نہ مجھے غیض میں نہ لاؤ
پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا
رکھتے ہیں ناخنوں میں برش ذوالفقار کی
ٹوکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
اک ہیں نہیں بہت ابھی ایسے ہزبر ہیں
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشان
ریتی پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شان
فی الواقعی ہم ایسے ہی تقصیر وار ہیں
کیوں غاصبو یہ نہر نہیں فاطمہ کا مہر
کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہی جبر و قہر
وعدے وہ کیا ہوئے وہ محبت کدھر گئی
مٹی ہوئے لکھے تھے عریضوں میں جو تپاک
ہوئیں گی تربتیں بھی یہیں گر ہوئے ہلاک
مشہور ہی کہ شیروں کا مسکن ترائی ہی
عالم میں برّ و بحر کا مختار کون ہی
ہی بے قصور کون گنہگار کون ہی
کلمہ نبیؐ کا پڑھتے ہو تم یا یزید کا
صدقہ ہی کس ولی کا جو عزت ملی تمھیں
ہادی ہوئے جو ہم تو ہدایت ملی تمھیں
محسن کو اس طرح سے کوئی بھولتا نہیں

ہم تو تمہیں سمجھتے ہیں سید کا خیر خواہ
کیا خوب میہمانوں کی دعوت ہے واہ واہ
الفت نہ دل دہی نہ تعارف نہ رسم و راہ
معصوم سے وہ کونسا ایسا ہوا گناہ
چشمے پہ جنگ فاطمہ کے نورِ عین سے
نامنصفو پھراتے ہو آنکھیں حسینؑ سے

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب
پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کہنی تک آستیں کو جو اُلٹیں دمِ عتاب
گردوں ہیں تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پر

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی
جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی
ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب
باندھے تھے ایک غولِ ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر
تولی زہیر قین نے شمشیرِ بے نظیر
جوڑا کماں میں ابنِ مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظِ لشکرِ بدخو پہ آگیا
غصّے سے بل ہلال کی ابرو پہ آگیا

بولے اُٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر
بس اب سزا ہیں ان کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر
بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر
آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی پھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جنابِ قاسمِ ذی شان نے آستیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسیں
بولے پکڑ کے نیمچے زینب کے مہ جبیں
شیروں سے کیا ترائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں
کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آ گئے تھے سب کے حضرتِ عباسؑ ذی حشم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیِ ستم
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی

چلّائی رو کے زینبِ ناشاد و نامراد
غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و عناد
ہمشیر کو نثارِ امامِ اُمم کرو
محمل سے مُنہ نکال کے فضّہ نے یہ کہا
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہی دلیر کو

زینب پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
کہدے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر
عباسؑ تم تو ساقیِ کوثر کے ہو پسر
مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیِ ستم
غربت زدوں پہ چاہیے اللہ کا کرم
ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں
بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
گھبرائے اہلِ بیتِ شہنشاہِ بحر و بر
غُل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی
ہی ہی خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہِ خوش نہاد
لوگو دعائیں اکبرِ مہرو پہ دم کرو

بلوہ کنارِ نہر ہی اے بنتِ مرتضیٰ
قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا
سب دشت گونجتا ہی یہ غصّہ ہی شیر کو
ہی ہی غضب ہوا اگر آیا اُنھیں جلال
غربت پہ ابنِ فاطمہ کی تم کرو خیال
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّے کو تھام لو

محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر
یہ نہر کیا ہی جس کے لیے رنج اس قدر
جنگل تمھے پسند ہی گزری ترائی سے
جلتی زمیں پہ بچّوں کو لیکر رہیں گے ہم
پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمھیں قسم
پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
کرسی سے جلد اٹھ کے پکارے شہِ انام
یکساں ہی برّ و بحر ہماری نگاہ میں

ہرچند اس میں کوئی تمھارا نہیں قصور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہی دور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہی عالی مقام کا

لے سکتے ہیں ترائی کو تم سے یہ نابکار
جرأت میں تم نہ ایک نہ یہ اہل کیں ہزار
بے آبِ تیغ دم میں یہ ناری ہلاک ہوں

ہی گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہی ہر جگہ خدا
کرتا ہی عاجزی وہی جو حق شناس ہی

صدقے ترے جلال کے ای میرے آفتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہی تاب
یہ کیا ہیں تم تو سدِّ سکندر کو توڑ دو

لازم ہی ان پہ رحم یہ امت ہی میں نثار
ان کے لیے حسن نے کیا جبر اختیار
ہو نوجواں مزاج میں غصّہ ہی آپ کے

آؤ تمھیں قسم ہی جنابِ امیر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں مشیرِ قلعہ گیر کی
کیا دشت کم ہی صابر و شاکر کے واسطے

عباس ادھر غضب میں بڑھے سوے فوجِ شام
بھیّا ہمارے سر کی قسم رُک لو حسام
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
بس خامشی جواب ہی ان کے کلام کا

کس پر یہ خشم ای شہِ مرداں کے یادگار
بخشا ہی ہر طرح کا تمھیں حق نے اختیار
گر منہ سے اُف کرو تو ابھی جل کے خاک ہوں

پر تم پسر رحیم کے ہو بخشدو خطا
مظلوم کو غریب کو غصّے سے کام کیا
ہم کو نبی کی روحِ مطہّر کا پاس ہی

یاد آگیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
جعفر ہو و بدلے میں شجاعت میں بو تراب
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو

کرتے تھے مصطفیٰ انھیں بیٹوں کی طرح پیار
دشمن پہ بھی رہا کرمِ شبّرِ کردگار
بیٹا وہ ہی قدم بہ قدم ہو جو باپ کے

بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہو درکار ہم کو جا
ہی عمرِ بے ثبات زمانہ ہی بے وفا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
حکمِ خدا ہی حکمِ شہنشاہِ بحر و بر
میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا

اُترے گی آکے نہر پہ اب شام کی سپاہ
اس دشت میں نہ اور ہی چشمہ کوئی نہ چاہ
اس فکر میں غلام کا دل آب آب ہی

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
وہ شیر ہو کہ دھاک ہی ساری خدائی میں

اس قوم سے نہ رد و بدل چاہیئے تمھیں
قربِ خدائے عز و جل چاہیئے تمھیں
بھائی جگہ مزاروں کی پہچانتا ہوں میں

ہی منکشف امام پہ احوالِ بحر و بر
صدمہ ہی دل پہ کیا میں کہوں تم سے یہ خبر
دولت مٹے گی یاں اسدِ کردگار کی

جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں

بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

کہہ دیجے ان سے کاٹ کے لے جائیں میرا سر
اب کچھ کہوں زباں سے کیا تاب کیا جگر
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ
سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ
پر عینِ مصلحت ہی جو حکمِ جناب ہی

کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
دریا کو تم تو لے چکے ای میرے مہ لقا
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہی ترائی میں

غصہ نہ برہمی نہ جدل چاہیئے تمھیں
جو ہم کہیں اُسی پہ عمل چاہیئے تمھیں
جو ہوگا اس زمیں پہ وہ سب جانتا ہوں میں

حق نے کیا ہی واقفِ اسرارِ خشک و تر
قبضہ تمھارا تا بہ قیامت ہی نہر پر
بھیّا یہی جگہ ہی تمھارے مزار کی

ہوتا ہے کیا ہزار کہیں ساکنانِ شام
بخشا ہے تم کو خالقِ اکبر نے یہ مقام
کہتے ہیں اس زمین پہ ملک آ کے صبح و شام
یاں ہوگی قبر حضرتِ عباسِ نیک نام
دیندار گرد قبر کے بستی بسائیں گے
شہروں سے لوگ یاں کی زیارت کو آئیں گے

سچ ہے کہ ہاتھ آپ کے آئی ہے کیا جگہ
پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہے کیا جگہ
ٹھنڈی ہوا میں سونے کو پائی ہے کیا جگہ
کیا سبزہ کیا نفیس ترائی ہے کیا جگہ
لنگر ہو تم نجات کی کشتی کے واسطے
لازم ہے قربِ نہر بہشتی کے واسطے

آؤ اب اپنی قبر کی جا ہم تمھیں دکھائیں
مقتل میں نخل بھی نہیں سایہ کہاں سے لائیں
قسمت میں یہ لکھا ہے کہ جنگل کی دھوپ کھائیں
چالیس روز تک نہ کفن اور نہ غسل پائیں
میدان ہو اور لاشِ حسینِ غریب ہو
بھائی قریب ہو نہ ترائی قریب ہو

عباس آبدیدہ ہوئے سن کے یہ کلام
بھائی کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چلے امام
فرمایا واں پہونچ کے جو تھا قتل کا مقام
دیکھو حسین ہوگا یہیں قتل تشنہ کام
بھائی مقامِ خیمۂ آلِ عبا ہے وہ
باہر ہے جو نشیب سے تربت کی جا ہے وہ

رونے لگے پکار کے عباسِ نامدار
شہ نے کہا کہ ضبط کرو تم پہ میں نثار
سن پائے گی جو زینبِ بیکس یہ حالِ زار
مرجائے گی تڑپ کے ابھی وہ جگر فگار
مجھ کو بہت خیال ہے زہرا کی جائی کا
مرنا کوئی بہن نہ سنے اپنے بھائی کا

قدموں پہ سر جھکا کے یہ بولا وہ نیک نام
ارشاد یہ تو کیجیے اے قبلۂ انام
پہلے مرے گا آپ سے یہ باوفا غلام
رو کر کہا کہ ہاں یہی ہووے گا لاکلام
مجبوری ہے کہ بھائی کو ہاتھوں سے کھوئیں گے
روؤ گے تم نہ ہم کو ہمیں تم کو روئیں گے

مژدہ یہ سن کے شاد ہوا وہ اسیرِ غم
سجدہ کیا کہ بھائی سے پہلے مریں گے ہم
ریتی پہ آ کے گاڑ دیا شبیر نے علم
برپا ہوئے خیامِ شہِ آسماں حشم
ذرے نجوم بن گئے سارے زمین پر
اترے خدا کے عرش کے تارے زمین پر

کھینچا فلک پہ خیمۂ زنگار گوں نے سر
تارِ شعاع تھے کہ طنابیں تھیں جادہ گر
جنگل کا اوج ہو گیا خیمہ کی شان سے
تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کا سب جو طور
شمسے کا اوج اوج تھا خیمے کا دور دور
سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
خیمے میں جا چکے جو حرم باصد احترام
کمریں اِدھر کھلیں اُدھر اتری سپاہِ شام
اُمڈا تھا دل جو سبطِ نبیؐ کی جدائی سے
آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
تھے دس ہزار مستعدِ جنگ تیغ زن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
لیکر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار
محمل ہیں میں تو سر کو پٹکتی تھی بار بار
پیارا رہے انھیں جنھیں پانی عزیز ہے
منہ رکھ کے منہ پہ بالی سکینہ نے یہ کہا
روتی تھی میں سُنی بھی نہ تم نے مری صدا
اِس بیکسی میں دلبرِ زہرا کا کون تھا
کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش بیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں

روشن ہوئے کلس کی تجلّی سے دشت و در
پردا حرم کا تھا کہ قناتیں اِدھر اُدھر
پلّہ زمیں کا اُٹھ کے ملا آسمان سے
سکّانِ عرش دیکھتے تھے فرش کو بغور
گویا کہ آسماں کے تلے آسماں تھا اور
سونا اُتر گیا ورقِ آفتاب کا
ڈیوڑھی پہ آ کھڑے ہوئے عباسِ نیک نام
بھائی کو لیکے خیمہ میں داخل ہوئے امام
زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے
صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پہ اے بہن
جیتا ہیں؛ زخمی ہوتے جو عباسِ صف شکن
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا
کیا جی میں آ گئی تھی یہ بھیّا بہن نثار
صدقے کروں وہ نہر لڑیں جس پہ نابکار
بھیّا ہمیں تمھاری جوانی عزیز ہے
عاشق کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا
بس اب کہیں نہ جائیو اچھے مرے چچا
آتے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا
غصّے میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں

فرمایا شہ نے بھائی سے اب کھولیے کمر
بیٹھے نہ تھے ابھی کہ یہ اکبر نے دی خبر
مجمع غضب سپاہ کا دریا کے پاس ہے

آخر ہوا وہ دن تو ہوئی رات کو یہ دھوم
اک لاکھ سے سوا ہیں جوانانِ شام و روم
کیسا شمار حصر نہ تھا انتہا نہ تھی

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدّتِ تعب
مُرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا

غش تھے ہم کو پیاس سے اطفالِ شاہِ دیں
تھا دودھ خشک بیٹھی تھی بانوے حزیں
خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی

رونے میں وہ پہاڑ سا دن جب ہوا تمام
شب تھی مسافروں کے لیے موت کا پیام
مل لو جنابِ فاطمہ کے نورِ عین سے

لکھوں سیاہی شبِ عاشور کا جو حال
چھایا ہوا تھا ابرِ غم و حسرت و ملال
پیاسوں سے پوچھو رات وہ کیونکر بسر ہوئی

مطلع دوم

گردوں پہ جب بیاضِ سحر کا ورق کھلا
بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا
پہونچا فلک پہ ماہ کو حکم انقلاب کا

زینب نے لے لی ہاتھ سے شمشیر اور سپر
فوج اور آئی شام سے یا شاہِ بحر و بر
شہ نے کہا کہ ہوسے۔ تمھیں کیا ہراس ہے

آ پہونچا لے کے فوجِ گراں ابنِ سعدِ شوم
آفت کی ہے یہ بھیڑ قیامت کا ہے ہجوم
دیکھا جو صبح کو کہیں بستر کی جا نہ تھی

نرغے میں آ گیا پسرِ سیّد العرب
پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب
شور آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا

جز آبِ اشک پانی کا قطرہ کہیں نہیں
دم توڑتا تھا جھولے میں اصغرِ سا نازنیں
باقر تڑپ رہا تھا سکینہ بلکتی تھی

آئی سیہ بلا کی طرح شامِ تیرہ فام
غل تھا کہ ایک رات کے مہمان ہیں امام
خالی سحر کو ہوگا زمانہ حسین سے

دفتر سیاہ ہوں شبِ دیجور کی مثال
کھولے تھے اہلِ بیتِ محمد سروں کے بال
بس مختصر یہ ہے کہ غضب کی سحر ہوئی

یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا
ظلمت نہاں ہوئی درِ باغِ شفق کھلا
موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

ہونے لگے چراغِ نجوم آسماں پہ گل
قرنا پھکی سپاہِ عدو میں بجا دُہل
برپا حسینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل
پڑھنے لگے نماز شہنشاہِ جزو و کل
قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پر
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر

سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر
فوجِ ستم میں ہو گئیں صف بندیاں اُدھر
دو چار تیر آ کے گرے جب قریبِ در
حضرت پہ آ کے روک لی عباس نے سپر
کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوجِ شام ہی
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہی

پھر بیٹھے جانماز پہ شاہِ فلک وقار
شانہ کیا محاسنِ اقدس میں چند بار
سر پر رکھا عمامۂ محبوبِ کردگار
پہنی قبائے خسروِ عالم بہ افتخار
پیدا ہوئے تھے خلق میں رحمت کے واسطے
باندھی کمر شفاعتِ اُمت کے واسطے

رخصت کو اہلِ بیتِ نبی میں گئے امام
قدموں پہ لوٹنے لگیں سیدانیاں تمام
وہ شور الفراق کا وہ یاس کے کلام
بچے بھی سر پٹکتے تھے لے لے کے شہ کا نام
روتے تھے یوں تو لپٹے ہوئے سب حسین سے
لیکن کلیجے پھٹتے تھے زینب کے بین سے

روتے تھے ماں کے پہلو میں زینب کے نونہال
پر غم میں بھائی کے اُسے مطلق نہ تھا خیال
گرنے میں تھامتے تھے جو ماں کو وہ خوش خصال
کہتی تھی مرنے جاتا ہی خیر النسا کا لال
قربان جاؤں منہ نہ پھرانا لڑائی سے
ہشیار رہیو بہرِ خدا میرے بھائی سے

قاسم سے کوئی کہتی تھی ای میرے نوجوان
چھپ جائے گی اب آنکھوں سے ہی ہی حسن کی شان
اِک سوختہ مادرِ علی اکبر کا یہ بیان
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو میری جان
رخصت کو ماں سے آئے ہو زلفیں سنوار کے
چڑھنا جہاد پر مجھے صدقے اُتار کے

دیکھا گیا نہ شاہ سے سیدانیوں کا حال
بس الوداع کہہ کے چلا فاطمہ کا لال
باہر جو آئے روتے ہوئے شاہِ خوش خصال
دیکھا کہ فوج سب ہی مسلح پئے جدال
جھک کر سلام غازیوں نے باادب کیا
گھوڑا سوارِ دوشِ نبیؐ نے طلب کیا

آیا عجب شکوہ سے شبدیزِ تیز گام
دامن قبا کا رکھ کے کمر میں بڑھے امام
چھوٹی قدم سے ہیں یہ ہوا غم زمین کو
حاصل ہوا جو فیضِ قدمبوسیِ جناب
روشن تھے بدر سے سمِ اسپِ صبا شتاب
انساں تو کیا ہیں دیدۂ انجم بھی بند ہیں

کس اوج سے خدیوِ زمین و زماں چلا
لیکر نشان علیِؑ ولی کا نشاں چلا
اختر نثار بخششِ سبطِ رسول تھے
سادات کے وہ چہروں کی ضو وہ علم کی شان
وہ برچھیاں سنبھالے ہوئے ہاشمی جوان
وار اُن کے معرکے میں ہزاروں پہ چل گئے

پہنچے جو اس شکوہ سے وہ غازیانِ دیں
اللہ رے جلوۂ قمرِ آسمانِ دیں
افروختہ تھا چہرۂ اقدس جناب کا
چلّوں میں جوڑنے لگے واں تیر اہلِ شر
لشکر سے چند گام بڑھے شاہِ بحر و بر
مطلق نہ کی تمیز خطا و صواب میں

عباسؑ نے کہا کہ ہوا پر ہیں یہ شریر
خاموش ہیں ادب سے جوانانِ بے نظیر
کیا قدرتِ خدا ہے کہ روباہ شیر ہوں

طاؤس و کبک دیکھتے تھے جلوۂ خرام
عباس نے رکاب کو تھاما بہ احترام
جبریل جھاڑنے لگے شہپر سے زین کو
اللہ ری ضیا مہِ نو بن گئی رکاب
ثابت تھا صدرِ زیں سے کہ ہے برجِ آفتاب
تارِ شعاع موئے ایالِ سمند ہیں

رہوار کیا زمیں پہ چلا آسماں چلا
دامن بھرے ہوئے علمِ زرفشاں چلا
ذرّے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے
تکتا تھا اُس زمیں کے ستاروں کو آسمان
رَن میں نہ مرتے مرتے گئی جن کی آن بان
قبضے چھٹے نہ ہاتھوں سے اور دم نکل گئے

گاڑا سپاہِ کفر کے آگے نشانِ دیں
روشن تھا جس کے نور سے سب خاندانِ دیں
شوکت تھی عرش کی تو جلال آفتاب کا
سینے حسینیوں نے ادھر کر دیئے سپر
حجّت تمام کی یہ نہ سمجھے وہ بد گہر
تیر آئے سرکشوں کی طرف سے جواب میں

مولا کہاں کلامِ نصیحت کہاں یہ تیر
موقع بس اب ہی جنگ کا اے آسمان سریر
جب اُن سے چھین لے کوئی دریا تو زیر ہوں

بولے حبیب رحم کی بھی انتہا ہی اب
گزرے ہیں سات روز کہ ہی روح پر تعب
کٹ جائیں پیاسے حلق ادا سر سے دین ہو
فرمایا واں کثیر ہی لشکر یہاں قلیل
نزدیک اب ہی کوثر و تسنیم و سلسبیل
ہاں اشتیاقِ خنجرِ قاتل ہمیں بھی ہی

یہ سُن کے شاد شاد ہوے وہ خوش اعتقاد
تیغیں پکڑ پکڑ کے جو نکلے پئے جہاد
کِس آبرو سے فدیۂ راہِ خدا ہوے
نصف النہار تک تھا ہی شورِ کارزار
رخصت اسے کیا تو اُسے روے زار زار
ایک ایک نے سعادتِ عقبیٰ حصول کی

لُٹنے لگی علی کی بضاعت دمِ زوال
زینب کے نورِ عین بھی جب کر چکے جدال
ستّر دلیر قتل ہوے حق کی راہ میں
اُس وقت تھا عجب شہِ دیں پر ہجومِ یاس
لاشے پڑے ہوے تھے عزیزوں کے آس پاس
اُٹھتا تھا دردِ دل تو قدم لڑکھڑاتے تھے

ہل من مبارز کی جو اعدا میں تھی پکار
ڈیوڑھی پہ تھا یہ شور کہ یا شاہِ نامدار
ہی ہی یہ کیسی آگ لگی ہی زمانے کو

دیجے رضا جہاد کی یا شاہِ تشنہ لب
بچوں کو بھوک پیاس میں تیسری ہی شب
اب سلسبیل پر کہیں پہونچیں تو چین ہو
اچھا لڑو کہ خالقِ کونین ہی کفیل
دے گا مجاہدوں کو خدا رتبۂ جلیل
در پیش عصر تک ہی منزل ہمیں بھی ہی

رخصت انھیں ملی کہ ملا گوہرِ مراد
میداں سے اُٹھ گئے قدمِ لشکرِ عناد
سر دے کے سب امام کے حق سے ادا ہوے
مرنے کو یہ چاہا وہ تڑپ کر ہوا نثار
جاتے تھے آپ لاش اُٹھانے کو بار بار
دم نکلے سب کے گود میں سبطِ رسول کی

کام آئے رن میں جعفر و مسلم کے نونہال
حضرت کو داغ دے کے سدھارا حسن کا لال
دو تشنہ کام رہ گئے ساری سپاہ میں
ڈھلنا وہ دوپہر کا وہ آندھی وہ لو وہ پیاس
رو کر فلک کو دیکھتے تھے شاہِ حق شناس
فرما کے یا علی ولی بیٹھ جاتے تھے

بھائی کو دیکھتے تھے کنکھیوں سے بار بار
دوڑو چلی جہاں سے سکینہ جگر فگار
قطرہ نہیں ہی پانی کا منہ میں چوانے کو

گردن جھکائے چُپ تھے شہنشاہِ بحر و بر
صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباسِ نامور
تلخ اُن کو زیست تھی اُنھیں سر بارِ دوش تھا

بڑھکر چچا سے کہتے تھے اکبر یہ دم بدم
فرماتے تھے اشارے میں عباسِ ذی حشم
پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہی

یہ کہہ کے رکھ دیا قدمِ شاہِ دیں پہ سر
صدمے سے قلب ہل گیا تھرّا گیا جگر
کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے

بھائی کے سر کو چھاتی سے لپٹا کے یہ کہا
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ باوفا
گزرے ہیں تین دن یونہیں اُس خوش صفات پر

بولے بہا کے اشک امامِ فلک جناب
صابر ہر اک بلا میں ہی فرزندِ بو تراب
مشتاق آپ دیر سے جنگ و جدل کے ہیں

کیا اختیار خیر دعا دیجئے ہمیں
ملئے گا اب کہاں یہ پتا دیجئے ہمیں
بھائی کی زیست قوتِ بازو کے ہاتھ ہی

یہ کہہ کے اس طرح ہوئے شبیر نوحہ گر
رخصت کی اہلِ بیت کو بھی ہوگئی خبر
چلائی عمو جان اِدھر آکے جائیے

لب برگِ گل سے خشک تھے رُخ آنسوؤں سے تر
پانی تھا غم سے اکبرِ ذی جاہ کا جگر
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا

رخصت کو عرض کرتے ہیں اب شاہِ دیں سے ہم
کہیو نہ کچھ تمھیں سرِ شبیر کی قسم
مر لے یہ جاں نثار تو پھر اختیار ہی

حضرت سمجھ گئے کہ اب ان کا بھی ہی سفر
طاقت نے تن سے کوچ کیا جھک گئی کمر
دل تھام کر زمیں پہ امامِ زماں گرے

بتلاؤ کیا ارادہ ہی اے میرے مہ لقا
پیاسی سکینہ مرتی ہی یا شاہِ کربلا
گر اذن ہو تو پانی کو جاؤں فرات پر

یہ موت کا پیام ہی بچوں کا اضطراب
اچھا یہ ہی صلاح تو کیجے تلاشِ آب
پانی کہاں کا سب یہ بہانے اجل کے ہیں

جینے کی کوئی شکل بتا دیجئے ہمیں
رو لیں لپٹ کے اتنی رضا دیجئے ہمیں
پوچھو ہمارے دل سے کہ برسوں کا ساتھ ہی

روئے جوان پسر کے لیے جس طرح پدر
گھبرا کے آئی بالی سکینہ قریب در
دیدار آخری مجھے دکھلا کے جائیے

یاں چڑھ چکے تھے گھوڑے پہ عباسِ حق شناس
بولی یہ مشک دے کے سکینہ بدرد و یاس
آئے صدا بھتیجی کی سنتے ہی در کے پاس
قربان عمو جان بجھا دو ہماری پیاس
پھکتا ہی دل عطش سے کلیجہ کباب ہی
سقائی کیجیے کہ یہ کارِ ثواب ہی

عباس نے کہا کہ مرا فخر ہی یہ کام
دی تم نے آبرو مجھے ای دخترِ امام
بی بی تمھارے باپ کا ادنیٰ ہوں میں غلام
اب ہو گیا جہاں میں بہشتی ہمارا نام
کوثر میں سمجھوں دوش پہ گر مشکِ آب ہو
تم بھی دعا کرو کہ چچا کامیاب ہو

کہہ کر یہ بات باگ اُٹھائی سمند کی
صورت بدل گئی فرسِ سربلند کی
چھل بل ہرن کی تیز پری تھی پرند کی
سرعت بلائیں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی
بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اُڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمین پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کیا ہی نشیب و فراز سے
چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اُڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے
راکب وہ ہیں جو فرقِ دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہی کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتنی وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال
وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال
وہ قصرِ آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اُسے دیتا براق تھا

گھوڑے کی یہ شکوہ وہ شوکت سوار کی
تصویر کھنچی ہوا پہ شہِ ذوالفقار کی
وہ نور وہ چمک علمِ زرنگار کی
خوشبو مہک رہی تھی نسیمِ بہار کی
پنجہ نہ تھا نشان ثریا آب کا
تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

بڑھ کر صدا یہ دیتا تھا اقبال دم بدم
افزوں ہو اجلال دوبالا ہو احتشم
نصرت پکارتی تھی جلو میں قدم قدم
جب تک ہی آفتاب درخشاں رہے علم
مطلب منافقوں کے جو ہیں ملتوی رہیں
یا رب ترے حسینؑ کے بازو قوی رہیں

اللہ رے جلالت و شوکت حضور کی
ہر جا فرس شکوہ دکھاتا تھا طور کی
ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہاں تاب زرد تھا
پہونچا جو اس جلال سے وہ آفتابِ دیں
گاڑا جو دبدبے سے علم ہل گئی زمیں
غازی ہے صف شکن ہے جری ہے دلیر ہے
گردے کے اپنے سر کی قسم لے نہ جاتے شاہ
گویا کھڑے تھے تیغ بکف ضیغمِ الٰہ
پلکوں کی تیزیوں سے کلیجے فگار تھے
خود اب تو دی ہے شہ نے اسے رخصتِ جدال
اس کا جلال حیدرِ صفدر کا ہے جلال
اُس معرکہ میں بس نہ چلا اس کا بھائی سے
یہ سُن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا
ہر غول میں عَلَم سے عَلَم جھک کے لڑ گیا
ہل چل میں چٹکیوں سے جو چلّے نکل گئے
تیغیں کھنچی لیے ہوے بھاگے جو اہلِ شر
تلواریاں پڑی تھی کسی کی تو واں سپر
یہ جنگ تھی کہ حشر کوئی جانتا نہ تھا
گھبرا کے ابنِ سعد نے لشکر کو دی صدا
اتنا ہراس نامور و ننگ کی ہے جا
سب مل کے روکتے نہیں اس تشنہ کام کو

دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی
بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی
مٹی میں یہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا
دیکھا سپاہ کو صفتِ شیرِ خشمگیں
ہٹ ہٹ کے مورچوں سے پکارے یہ اہلِ کیں
ہٹتا نہ تھا ترائی سے جو یہ وہ شیر ہے
دریا سے اس جری کو ہٹا سکتی تھی سپاہ؟
کیا قہر کی نگاہ تھی اللہ کی پناہ
جنبش بھوؤں کی تھی کہ سروہی کے وار تھے
دریا کو ایک حملے میں لے گا یہ خوش خصال
سرکش جو لاکھ ہوں تو کرے دم میں پائمال
دیکھو یہ شیر اب نہ ہٹے گا ترائی سے
ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
جو رہ گیا نشان وہ خجالت سے گڑ گیا
اس صف کے تیر سہم کے اُس صف پہ چل گئے
کٹ کر کسی کا ہاتھ گرا اور کسی کا سر
برچھی تھی اس شقی کی تو اُس نحس کا جگر
بیٹے کو باپ خوف سے پہچانتا نہ تھا
چھوڑ آئے مورچوں کو شجاعو یہ کیا کیا
وہ کون تھے علیؑ سے لڑے جو وغا
کھوتے ہو معرکے میں بزرگوں کے نام کو

قاتل تمھارے جد و پدر کا تھا جو دلیر
ہاں غازیو اُسی کا جگر بند ہے یہ شیر
کرتے ہیں رستموں کو زبردستیوں سے زیر
دشمن کو پا کے واہ یہ کم جرأتی یہ دیر
بڑھ بڑھ کے یوں لڑو کہ تہمتن بھی گرد ہو
تو کشتگانِ بدر کا بدلہ جو مرد ہو

یہ سُن کے سب کو جوش حمیّت کا آگیا
ابلیس آکے راہِ ضلالت بتا گیا
پھر ابرِ فوجِ شام لبِ نہر چھا گیا
شورِ دہل سے رعد کا دل تھرتھرا گیا
جو جو تھے منتشر وہ پرے پھر بہم ہوئے
پھر سب نشان کھل گئے نیزے علم ہوئے

پڑھکر رجز علیِ ولی کا پسر بڑھا
گویا شکار کھیلنے کو شیرِ نر بڑھا
دریاے قہرِ خالقِ جن و بشر بڑھا
بہرِ نبرد مالکِ فتح و ظفر بڑھا
تڑپا جو رخش برق نگاہوں سے گر گئی
آہ خدا کے شیر کی آنکھوں میں پھر گئی

کانپے طبقِ زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہواے سرد
گرمی سے رَن کی ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

نکلی اُدھر غلاف سے وہ برقِ شعلہ ریز
چلنے میں ذوالفقار تھی جس کی زبانِ تیز
چمکے شرر بھڑکنے لگی آتشِ ستیز
گھیرا اجل نے بند ہوئے کوچۂ گریز
آیا خدا کا قہر ہر اک روسیاہ پر
بجلی محیط ہو گئی ساری سپاہ پر

چمکی گری تڑپ کے کلیجے ہلا گئی
جو تھے ہوا پہ خاک میں اُن کو ملا گئی
بھڑکی دلوں میں آگ وہ پانی پلا گئی
جوہر دکھا کے فوج کو ہیرا کھلا گئی
دعویٰ تھا خونِ قاسمؑ یوسف جمال کا
یوں تیغ نے عوض لیا شبیرؑ کے لال کا

کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں
ٹھہری نہ بے لہو پیے دم بھر لڑائی میں
ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں
پہلے انھیں نے کاٹ گئی سر لڑائی میں
دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو راہوار سے
یہ اُٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ رُکی نہ تھمی کہیں
چمکی کہیں کسی پہ کسی جا دمی کہیں
کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے
جل جل کے آبِ تیغ سے کفّار مر گئے
نامی تھے جتنے سب وہ نمودار مر گئے
غل تھا کہ زلزلے میں زمیں آج رن کی ہے
جب وار چل گیا سپرِ آہنیں کٹی
مغفر کٹا دو نیم ہوا سر جبیں کٹی
چو رنگ تھا فرس تو دو پارا سوار تھا
آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی
بے جاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی
آنچ اُس کی قہر تھی کوئی کیونکر الگ نہ جلے
بے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جاں گزا لگی
چار آئینہ پہ ضربتِ قہرِ خدا لگی
برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا
پلٹی اُدھر سے جب تو اِدھر کا پرا نہ تھا
چھلکا ہوا تھا سم بدن اُس کا ہرا نہ تھا
سیلِ فنا تھا جنگ میں کاٹ اُس کی دھار کا
گورا وہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک
موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک
اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں

اِک دم بھی کی نہ اُس کی برش نے کمی کہیں
فوجوں میں ابتری تھی کہیں برہمی کہیں
ہر جا تھے ضربِ تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے
پس پس کے بھاگنے میں جفاکار مر گئے
دو ہاتھ جب ادھر سے چلے چار مر گئے
کہتا تھا شیر ہاں یہ مدد پنجتن کی ہے
دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی
سینے کو لیکے زیں سے جو اُتری زمیں کٹی
اللہ رے منہ کہ تیغ نے جانا خیار تھا
خالی صفوں میں اور سوا ابتری ہوئی
پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل پر ڈری ہوئی
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی لگ نہ جاے
اِک آگ تھی کہ چنبرِ گردن میں جا لگی
کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اُس کی ہوا لگی
پانی اثر دکھاتا تھا لوہے کو آگ کا
کاٹے تھے سر پہ فرق برش میں فرانہ تھا
خوں سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا
دم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا
تھی صاف تیغِ حیدرِ کرّار کی چمک
اُس پار تک پہونچتی تھی اس پار کی چمک
خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو
تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو
تیغ آئی جس پہ اس کا بھی وار اُس پہ چل گیا
ثابت ہو جس پہ زور کوئی ایسی کماں نہ تھی
گر میان تھا تو تیغ دمِ امتحاں نہ تھی
جرار سر جھکائے تھے تلوار کی طرح
جب ضرب کی زمین کے طبق ہل کے رہ گئے
زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے
برہم مزاجِ لختِ دلِ بوتراب تھا
ممکن نہ تھا کہ ایک کو سو میں اماں ملے
جو نامور بڑے تھے نہ اُن کے نشاں ملے
کیوں معرکے میں تیغ دودم سرخرو نہ ہو
زہرہ کسی کا آب تھا ڈر سے کسی کا دل
آفت تھی قہر تھی برشِ تیغ جاں گسل
ٹکڑے تھے منہ سزا تھی یہ اعمالِ زشت کی
ڈوبے لہو میں گھاٹ ستمگار روک کے
جب بھاگتا سپر کو سیہ کار روک کے
ٹھہرا جہاں لیا وہیں گھوڑے کو پھیر کے
وہ تیغ شعلہ زا کی چمک وہ فرس کی جست
بجلی گری پھرا جو ذرا دستِ حق پرست
افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے

کشتوں کے بڑھتے جاتے تھے انبار چار سو
پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو
وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا
تیر افگنوں کی خوف سے خاطر نشاں نہ تھی
یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی
سرکش خموش تھے لبِ سوفار کی طرح
سر اُڑ گئے گلوں سے گلے مل کے رہ گئے
بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے
لاشے اُلٹ گئے یہ نیا انقلاب تھا
مارا اُنھیں چھپے ہوئے ظالم جہاں ملے
ریتی پہ گر ملے بھی تو لاشے تپاں ملے
ایسی جگہ نہ تھی کوئی جس جا لہو نہ ہو
بھائی ٹھہر نہ سکتا تھا بھائی کے متّصل
کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منتقل
ہیئت بدل گئی تھی ہر اک بدسرشت کی
دم بھر نہ رک سکا کوئی اک وار روک کے
عباس مسکراتے تھے تلوار روک کے
کوئی شکار بچتا ہی پنجے سے شیر کے
رستے کھلے ہوئے نہ صفیں وہ نہ بند و بست
غارت وہ مورچہ ادھر آفت اُدھر شکست
سب چھاؤنی اُجاڑ محلّے لٹے ہوئے

ہر اک علم کی چوبِ ضلالت نشاں کٹی
ترکش کٹے قلم ہوئے نیزے سناں کٹی
روحوں کے ساتھ تن تھے نہ روحیں تنوں کے ساتھ
ناری صفوں میں جل گئے جب شعلہ رو ہوئی
شب کو چمن کھلا جو سپر خوں سے تر ہوئی
چلائی موت صدقے تری کج ادائی کے

جب سن سے فوجِ کفر پہ وہ جنگجو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی
غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
جس کے گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
دو پتلیاں بھی بہرِ تماشا تلی ہیں

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا
اِس ہاتھ سے جو تیغ تو اُس سے سپر جدا
وہ تہلکے بھی ہولِ قیامت سے کم نہ تھے
اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی
برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی
جو اس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا

اُٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی
صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی
دم توڑتے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی
منہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی
ٹکڑے ہوئی زرہ کمرِ پہلواں کٹی
تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

چمکی ادھر یہ تیغ تجلی اُدھر ہوئی
سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی
بولی نکل کے روح نثار اس صفائی کے
گویا سمومِ قہرِ خدا چار سو چلی
ٹکڑے اُڑا دیے ذبح کیا سرخرو چلی
دم بھر میں فیصلہ یہ کرشمے قضا کے ہیں

بسمل بھی تیغِ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں
ہر نخلِ قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا
بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا
کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی
رستم بھی ہو تو ٹھاٹھ بدلنے نہ دیتی تھی
جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا
پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی
پیری جگر میں خوں میں نہائی جدا ہوئی
نکلی جو خوں میں پیر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اس کی چمک دیکھ دیکھ کے
تھراتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے
جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
تنتی تھی سر تنوں سے جدا دیکھ دیکھ کے
بے خود تھی آپ اپنی ادا دیکھ دیکھ کے
کہتی تھی تیغ گو کہ سروہی کا ہاتھ ہوں

سب سے جدا تھی تیغ کے چلنے کی قطع راہ
خط جا بجا تھے خاک پہ مابینِ رزم گاہ
کترا کے لو پھر آئی لہو چاٹتی ہوئی
گھیرا جو یک بیک غضبِ کردگار نے
کھینچا سر آسماں پہ زمیں کے غبار نے
دن چھپ گیا یہ گرد پڑی رُتبے مہر پر

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنات کانپ کے کہتے تھے الحذر
اندھیر ہے اُٹھی برکت اب جہان سے
دریا کی فوج گھاٹ سے جب ہٹ گئی تمام
نعرہ کیا ترائی تو شیروں کا ہے مقام
تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو

وہ حکم اور تھا کہ نہ تھی بولنے کی تاب
لاکھوں میں اب تو دے کوئی اس تیغ کا جواب
افسوس ابنِ سعدِ ستمگار ٹل گیا

رہ جاتی تھی سما کو سمک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا
کرتی تھی ناز حسنِ بہا دیکھ دیکھ کے
چشمک قضا کی تھی کہ ذرا دیکھ دیکھ کے
تو میرے دم کے ساتھ ہے میں تیرے ساتھ ہوں

اس صف کے ہاتھ پاؤں قلم وہ پرا تباہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی
گھوڑے بھگا کے فوجِ ضلالت شعار نے
سر پر اُڑائی خاکِ سیہ روزگار نے
مٹی کا پل بندھا تھا محیطِ سپہر پر

جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
دُنیا میں خاک اُڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
لوٹ گیا زمیں کا طبق آسمان سے
ساحل تک آئے حضرتِ عباسِ نیک نام
وہ زور شور کیا ہوا اے ساکنانِ شام
ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

ریتی پہ کیا سپاہ کی مٹی ہوئی خراب
یوں خاک میں ملاتے ہیں فرزندِ بوتراب
پر خیر کچھ بخار تو دل کا نکل گیا

یہ بات کہہ کے ڈال دیا نہر میں سمند
چمکا جو عکسِ روے علمدارِ ارجمند
دریا کے دل میں تھی جو کدورت وہ دُھو گئی
جلوے جو نہر میں علمِ سبز نے دکھاے
پانی میں حب کہ شرم سے خورشید ڈوب جاے
ہر سنگ ریزہ نور سے درِّ خوش آب تھا
چھاتی تک اُس نے پانی کو دیکھا جو ایک بار
حسرت سے منہ پھرا کے نظر کی سوے سوار
تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے
گردن ہلا کے کہنے لگا اسپِ تیز گام
اُس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
مطلب یہ ہے کہ ذکرِ وفا چار سو رہے
ہر چند تین روز سے ہے پیاس کا وفور
پر ہے یہ امر آپ کی دریا دلی سے دور
ناموسِ مصطفٰےؐ میں تلاطم ہے رات سے
بچّوں کا حال سُن کے لگا دل پہ تیرِ غم
مشکیزہ بھر کے دوش پہ رکھا بچشمِ نم
بڑھتے ہی بحرِ ظلم کی موجوں میں گھر گیا
ہاں راہ روک لو یہ ہوئی چار سو پکار
ڈھالیں بڑھیں بہم کہ اُٹھا ابرِ کوہسار
ہلتا تھا چرخ غلغلۂ دار و گیر سے

طاؤس دُم اُٹھا کے بنا اسپ سربلند
پانی کی آب و تاب ہوئی چاند سے دو چند
آنکھوں میں مچھلیوں کے چکا چوند ہو گئی
اک شور تھا کہ خضر علیہ السلام آے
پھر آنکھ میں حباب کی کیا آسماں سماے
لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا
گھوڑے کا دِل ہوا صفتِ موج بے قرار
بولے یہ باگ چھوڑ کے عباسِؑ نامدار
ہم پر تو بے حسینؑ یہ پانی حرام ہے
بے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
آقا ابھی حسینؑ کے بچے ہیں تشنہ کام
تر خشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے
پیتا یہ خانہ زاد بھی پیتے اگر حضور
جائیں بچیں صغیروں کی فکر اس کی ہے ضرور
اب جلد مشک بھر کے نکلیے فرات سے
روے لہو کے اشکوں سے عباسِؑ باکرم
نکلا پلٹ کے نہر سے شبدیزِ خوش قدم
سقا نبیؐ کی آل کا فوجوں میں گھر گیا
برچھے اُٹھا اُٹھا کے بڑھے سیکڑوں سوار
تیغیں علم ہوئیں کہ بندھا آہنی حصار
حلقہ کسی کماں کا نہ خالی تھا تیر سے

کہتا تھا گر نہ تول کے ایک ایک پہلوان
بڑھ کر جواب دیتے تھے عباسؑ نوجوان
کیا منہ جو مشک لے کوئی جب تک یہ ہاتھ ہے

طفلی سے تھی ہمیں انھیں عہدوں کی آرزو
اک مشک اک نشانِ شہنشاہِ نیک خو
گر مر گئے تو رنج و الم لیکے جائیں گے

جھپٹے یہ کہہ کے تیغِ دو دستی علم کیے
حملے صفوں پہ صورتِ شبیرِ و ثم کیے
سن سن پلٹ کے چلنے میں کمریں خم کٹ گئیں

بوچھار ایک بیک ہوئی تیروں کی ہے غضب
یہ شکل دو جہاں کے امیروں کی ہے غضب
نیزے تھے اور چاند سے پہلو دلیر کے

زخمی تھے پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار
بڑھ بڑھ کے غول فوج کے ہٹتے تھے بار بار
دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا

جھکتے علم کو روک کے کہتے تھے بار بار
دیتے تھے دم بدم یہ صدا شاہ ذوالفقار
پانی کے واسطے یہ کبھی رن پڑا نہیں

وا حسرتا وہ فوج کا بلوہ وہ ایک جان
لڑنے کی فکر مشک کا دھڑکا علم کا دھیان
چمکی سناں تو روح بدن سے رواں ہوئی

رکھ دو یہ مشک ای اسد اللہ کے نشان
چہرہ بگاڑ دوں گا سنبھالے رہو زبان
ای بے حمیتو مری جاں اس کے ساتھ ہے

دونوں امانتیں ہیں یہ ای فوجِ کینہ جو
اس سے جہاں میں نام ہے اور اس سے آبرو
مختار اُن کا جو ہے اُسے دے کے جائیں گے

دونوں طرف کے نیزۂ خطی قلم کیے
تیغِ دو دم سے بند لعینوں کے دم کیے
آدھی صفیں تو بچھ گئیں آدھی اُلٹ گئیں

تیغیں چلیں عقب سے شریروں کی ہے غضب
بجھنے نہ پائی پیاس صغیروں کی ہے غضب
تیروں نے چھان ڈالا تھا سینے کو شیر کے

چہرے پہ زخم کھا کے جھپٹتے تھے بار بار
سر تن سے پانچ سات کے کٹتے تھے بار بار
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا

قوت عطا کرو مجھے یا شیرِ کردگار
بیٹا ترے تھکے ہوئے بازو کے ہیں نثار
کاندھے پہ مشک لیکے کوئی یوں لڑا نہیں

فاقہ وہ تین دن کا وہ سوکھی ہوئی زبان
جی سن سے ہو گیا کہیں کڑکی اگر کمان
روکا سپر پہ تیر تو خاطر نشاں ہوئی

کھاتے تھے تن پہ زخم کچھ اپنا نہ تھا الم
بہتا تھا خون رکابوں میں تھمتے نہ تھے قدم
اعدا ہدف بنائے تھے کینے سے مشک کو
تلوار ہاتھ میں علمِ شاہ دوش پر
اک تیغ تیز چل گئی ناگاہ دوش پر
صدمہ ادھر تو مشک کا جان حزیں پہ تھا
شانے سے یوں اُبل کے بہا خون کہ الاماں
مچھلی کی طرح ہاتھ تو ریتی پہ تھا طپاں
بے دست ہو گئی تھی جو اُس صفدری کے ساتھ
دہنا تھا ہاتھ تیغ اُسی میں تھی، ہائے ستم
تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم
کس سے ہٹائیں فوج کو کس سے دغا کریں
ڈر سے قریں تو آ نہ سکا کوئی نابکار
اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار
ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پر نگاہ کی
گرزِ ستم سے شق ہوا ناگہ سرِ جناب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب
تڑپے اُٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
ان کا تو یاں ہے کوچ سنو واں کی اب خبر
لپٹا ہوا ہے چھاتی سے عباسؑ کا پسر
زینب کھڑی ہے ڈیوڑھی پہ اور دل پہ ہاتھ ہے

مضطر تھا مشک کے لیئے وہ صاحبِ کرم
قوت کو ضعف ضعف کو قوت تھی دم بدم
پر یہ جدا نہ کرتے تھے سینہ سے مشک کو
ہرنے پہ گاہ مشک رکھی گاہ دوش پر
تلوار کیا پہاڑ گرا آہ دوش پر
دیکھا جو پھر کے دستِ مبارک زمین پہ تھا
تیورا کے جھومنے لگے عباسِ نوجواں
لیکن جدا نہ ہوتی تھیں قبضے سے اُنگلیاں
تلوار بھی تڑپتی تھی دستِ جری کے ساتھ
اب تھاما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علم
اُلجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہو گیا قلم
بتلاؤ اب کہ حضرتِ عباسؑ کیا کریں
پر تیر سب لگانے لگے باندھ کر قطار
پانی کے ساتھ سینے سے چھوٹی لہو کی دھار
ہرنے پہ سر پٹک کے بہشتی نے آہ کی
تھرائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سے مشکِ آب
گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے
ڈیوڑھی کے پاس بیٹھے ہیں حضرت برہنہ سر
روتی ہے سر جھکائے سکینہؑ قریبِ در
بکھرائے بال زوجۂ عباسؑ ساتھ ہے

زینبؓ سے عرض کرتی ہے وہ کردہ دل فگار
کچھ دم اُلجھ رہا ہے نہیں قلب کو قرار
خیراب نہیں ہے خیر کے انداز اور ہیں
کِس سے کہوں جو دَوڑ کے لائے کوئی خبر
یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے اُدھر
ماتم میں نوجوان کے دل اندوہ ناک تھا
رستے میں لڑکھڑاتے تھے جب ضعف سے قدم
فرماتے تھے تڑپ کے پسر سے شہِ اُمم
بازو پکڑ کے دلبرِ زہراؓ کو لے چلو
اک اک قدم پہ ضعف و نقاہت ہے سدِ راہ
جیتے رہے تھے ٹھوکریں کھانے کو آہ آہ
شق ہو جگر جو صبر اُدھر سے عطا نہ ہو
ٹھہرو کہ پاؤں اب نہیں قابو میں اے پسر
سینہ لہو ہے دل ہے تپاں چاک ہے جگر
لو اتنے بولنے میں بدن سرد ہو گیا
اس شکل سے ترائی میں پہونچے جو شاہِ دیں
بابا یہی ہے لاشِ علمدارِ مہ جبیں
رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہ پیار دیکھیے
حضرت پکارے جان بھی ہے جسمِ زار میں
کی عرض دم تو ہے جسدِ زخمدار میں
کیجے ذرا ملاحظہ چہرے کے نور کو

ہے ہے یہ شور نہر پہ کیسا ہے میں نثار
گرتی ہے کانپنے میں ردا سر سے بار بار
بی بی یہ سب ہمارے رنڈاپے کے طور ہیں
پردا اُٹھا کے اب میں نکلتی ہوں ننگے سر
دَوڑے زمیں سے اُٹھ کے شہنشاہ بحر و بر
تلوار ہاتھ میں تھی گریبان چاک تھا
اکبر سنبھال لیتے تھے بابا کو دم بدم
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا ہے الم
بیٹا چچا کی لاش پہ بابا کو لے چلو
عباس کیا بچھڑ گئے گھر ہو گیا تباہ
وہ کہتے ہوں گے لاش پہ اب تک نہ آئے شاہ
یارب کسی سے خلق میں بھائی جدا نہ ہو
تم ہاتھ تھامتے ہو جھکی جاتی ہے کمر
اکبر بتاؤ ہاتھ میں رکھوں کدھر کدھر
کیا دکھ ہے یہ کہ میں ہمہ تن درد ہو گیا
رو کر یہ شہ سے کہنے لگے اکبرؑ حزیں
گھوڑا کہیں ہے تیغ کہیں ہے علم کہیں
شانے کٹے ہیں شانِ علمدار دیکھیے
یا مر گئے تڑپ کے مرے انتظار میں
پر منہ سے بولتے نہیں کچھ احتضار میں
آنکھیں کھلی ہیں دیکھ رہے ہیں حضور کو

چلائے گر کے لاش پہ شبیرؑ نامدار
اس نزع میں بھی تھا تمھیں بھائی کا انتظار
شاید زبان ہی بند جو لب کھولتے نہیں
مرجائے گا حسینؑ برادر جواب دو
اب جاں بلب ہی سبطِ پیمبرؐ جواب دو
لکنت زبانِ خشک کو ہی تشنہ کام ہیں
سُن لو تمھیں دیا ہی سکینہ نے کچھ پیام
جنبش ہوئی لبوں کو بھتیجی کا سُن کے نام
قدموں پہ آنکھیں ملنے کو دل بے قرار تھا
منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہ خوش خصال
ان سوکھے ہونٹوں پہ صدقے علی کا لال
رُخ کیوں ہی زرد کون سی ایذا گزرتی ہی
گودی میں ہی مری دمِ آخر تمھارا سر
گزرے گی ہم پہ جو تمھیں اُس کی بھی ہی خبر
شمشیر حلقِ خشک پہ چلتی ہی کس طرح
یہ بات سُن کے نزع میں عباسؑ تھرتھرائے
دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے
ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
اکبر نے عرض کی کہ چچا جان مر گئے
منہ تو اُٹھاؤ خاک سے رخسار بھر گئے
اب کون دے گا دُکھ میں نبی کے پسر کا ساتھ

بھیا تمھاری نرگسی آنکھوں کے میں نثار
آنکھیں بھر آکے ڈھونڈھتے ہو ہم کو بار بار
روتے ہوے ہم آے تو اب بولتے نہیں
اے میرے نوجوان مرے صفدر جواب دو
اے نورِ چشمِ ساقیِ کوثر جواب دو
بھیا تمھارے سر کی قسم ہم تمام ہیں
ایسا نہ ہو کہ یاں چلی آوے وہ تشنہ کام
کی عرض اب غلام کی رخصت ہی یا امام
مولا کے دیکھنے کا فقط انتظار تھا
کیوں چپ ہوے کچھ اور کہو اپنے دل کا حال
بھیا مدد کو آے ہیں اب شبیرِ ذوالجلال
کیوں دم بدم کراہتے ہو کیا گزرتی ہی
اور پائنتی جوان بھتیجا ہی نوحہ گر
سینہ پہ ہوگا تیغ لیے شمرِ بد گہر
دیکھیں ہماری جان نکلتی ہی کس طرح
قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آے
پُرخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لاے
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا
جھک کر پکارے شاہ کہ بھیا کدھر گئے
وا حسرتا حسینؑ کو بے آس کر گئے
دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

اے میرے شیر صف شکن اے میرے نوجواں
شیر خدا کا آج جہاں سے مٹا نشاں
پاؤں گا تم سا چاہنے والا میں اب کہاں
تم کو حسینؑ جانتا تھا اپنے تن کی جاں
تیغوں میں اب سپر نہیں بھائی کی ہوتے ہو
بازو کٹائے شیر سے دریا پہ سوتے ہو

آتے ہی بھا گئی تھی ترائی کی جا تمھیں
بخشی خدا نے قبر بھی سب سے جدا تمھیں
اللہ کیا پسند تھی یاں کی ہوا تمھیں
آخر وہی ہوا کہ جو منظور تھا تمھیں
اتنی جگہ کے واسطے بچھڑے حسینؑ سے
بھیا ہوائے سرد میں اب سوؤ چین سے

قسمت میں ہے کہ دھوپ ہو جنگل کی اور ہم
کیا خوب ہو اگر یہیں نکلے ہمارا دم
کیا تفرقہ دکھایا ہے گردوں نے ہے ستم
الفت یہ چاہتی تھی کہ قبریں بھی ہوں بہم
روئیں سرہانے بیٹھ کے جو سوگوار ہوں
ہم دونوں بھائیوں کے برابر مزار ہوں

آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار
اے میرے لال تیرے تڑپنے کے میں نثار
ہے ہے جہاں سے اٹھ گیا ایسا وفا شعار
میرا پسر ہے آج سے عباسِ نامدار
بیٹا بلائیں لاش کی لینے کو آئی ہوں
پرسا تمھارے بھائی کا دینے کو آئی ہوں

واری تم اب یہ مشک و علم لیکے جاؤ گھر
چلائے تب یہ رو کے شہنشاہِ بحر و بر
ایسا نہ ہو نکل پڑے زینبؑ برہنہ سر
اماں کمر تو ٹوٹ گئی جائیں اب کدھر
ہم مر گئے کہ خلق سے بھائی گزر گیا
بازو ہمارا تھامنے والا تو مر گیا

اکبر سے پھر کہا کہ علم خاک سے اٹھاؤ
بیوہ ہوئی ہے چچی اسے پرسا دو خاک اڑاؤ
پرخون یہ مشک خیمۂ عصمت میں لیکے جاؤ
بیٹا چچا کے بچوں کو جا کر گلے لگاؤ
پوچھیں جو سب کہ سبطِ پیمبر کدھر گئے
کہہ دو سمجھو کہ بھائی کے لاشے پہ مر گئے

اکبرؑ یہ شہ سے سن کے جو روئے بصد بکا
تڑپے اک آہ کر کے شہنشاہِ کربلا
ناگاہ آئی در سے سکینہ کی یہ صدا
بابا میں اب نکلتی ہوں گھر سے برہنہ پا
روتے ہیں آپ کیوں مرے عمو کدھر گئے
حضرت نے دی صدا کہ جہاں سے گزر گئے

فرما کے یہ زمین سے اُٹھے شاہِ انس و جاں
پہونچے حرم سرا کے جو نزدیک ناگہاں
اندھیر ہے جہان مجھے کچھ سوجھتا نہیں
ڈھونڈوں کہاں میں اے مرے عمو کدھر گئے
دریا سے مشک بھیجدی اور خود گزر گئے
شانے کٹے تھے مشک بھی تیغوں سے کٹ گئی
غل پڑ گیا کہ شہ کے علمدار ہاے ہاے
اے ابنِ فاطمہؓ کے مددگار ہاے ہاے
چھوٹے سے ہاتھ رکھ کے دلِ دردناک پر
حضرت نے لا کے گاڑ دیا صحن میں علم
سب سے کہا کہ جینے نہ دیگا ہمیں یہ غم
پوچھو ہمارے دل سے مصیبت جدائی کی
بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا ہزار حیف
بازو مرا قوی تھا سو ٹوٹا ہزار حیف
فریاد ہے لعینوں نے ہم پر ستم کیا
زیرِ علم تھا زوجۂ عباسؑ کا یہ حال
چلاتی تھی یتیم ہوئے میرے دونوں لال
ہے ہے علی کا نورِ نظر مجھ سے چھٹ گیا
ناگہ صدا علی کی یہ آئی کہ اے بہو
آئی ہے تیرے پُرسے کو زہرا کشادہ مو
بھائی کے غم میں لال مرا دردمند ہے

رو کر علم سے باندھ دی وہ مشکِ خوں چکاں
سر پیٹ کے سکینہ نے تب یہ کیا بیاں
ہے ہے علم تو آیا ہے میرا چچا نہیں
مجھکو پتا دیا نہ وہاں کا جدھر گئے
پانی پیا نہ تشنہ دہن کوچ کر گئے
وہ کیا کریں ہماری ہی قسمت ہی لٹ گئی
اے نورِ چشمِ حیدرِ کرار ہاے ہاے
اے فوجِ شہ کے جعفرِ طیار ہاے ہاے
دے مارا سر کو بالی سکینہ نے خاک پر
اور گر پڑے زمیں پہ شہنشاہِ باکرم
جن سے جدا نہ ہوتے تھے کھوئے اُن کو ہم
بھائی ہی جانتا ہے محبت کو بھائی کی
چھوڑا نہ پھل نہ پھول نہ بوٹا ہزار حیف
اُمت نے میرے باغ کو لوٹا ہزار حیف
تیغوں سے سروِ باغِ علی کو قلم کیا
ماتھا بھرا تھا خاک سے بکھرے ہوئے تھے بال
دنیا سے کھو گئے مجھے عباسِ خوش خصال
میں رانڈ ہو گئی مرا اقبال لُٹ گیا
زانو پہ تھا مرے سرِ عباسِ نیک خو
بی بی بس اب حسینؑ کو رو کر رُلا نہ تو
اب صبر کر کہ صبر خدا کو پسند ہے

ہاں روؤ مومنو یہ بکا کا مقام ہے
اب رخصتِ حسینِ علیہ السّلام ہے
موت آئی تو شریکِ عزا کون ہووے گا
آگے تمھارے مرتے جو عباسِ باوفا
تم سب کو دیکھتے ہیں شہنشاہِ کربلا
سمجھو شریکِ بزم سے شہ مشرقین کو
یہ کہہ کے ہائے حضرتِ عباس خاک اُڑاؤ
ہے ہے حسین کہہ کے زمین پر پچھاڑیں کھاؤ
کل خاک میں ملائیں گے اس تشنہ کام کو
اے بے دیار و بے سر و سامان الوداع
اے دو جہان کے سید و سلطان الوداع
آہ و بکا سے ہم کبھی غافل نہ ہوئیں گے
مولا ضریحِ پاک پہ بلوائیے شتاب
رہ جائے گی ہوس جو دیا زیست نے جواب
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے

تم میں شریک روحِ رسولِ انام ہے
چہلم کی مجلسوں کا بھی آج اختتام ہے
جو سال بھر جیے گا وہ پھر شہ کو روئے گا
پُرسا نہ دیتے سبطِ رسولِ خدا کو کیا
زہرا ابھی ننگے سر ہے قیامت کر و بپا
دے لو جوان بھائی کو پُرسا حسین کو
پیٹو سروں کو ہاتھوں سے اور اشکِ خوں بہاؤ
پُرسا پسر کا فاطمہ زہرا کو دے کے جاؤ
رخصت کرو حسینِ علیہ السّلام کو
اے بنتِ مصطفےٰ کے دل و جان الوداع
اے شیعیانِ ہند کے مہمان الوداع
جب تک جئیں گے آپ کی غربت پہ روئیں گے
اب ہجر کی انیس کے دل کو نہیں ہے تاب
خاکِ شفا ملے مجھے یا ابنِ بوتراب
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کے ضریح سے

رباعی

گھر میں ڈھونڈو نہ انجمن میں ڈھونڈو
گلزارِ نجف میں مدح خواں ہوگا انیس
مرقد میں نہ ڈھونڈو نہ کفن میں ڈھونڈو
بلبل کو جو ڈھونڈو تو چمن میں ڈھونڈو

مرثیہ (۵)

بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر
نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر
ڈھونڈھ لی راہِ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
واہ رے طالعِ بیدار نہ ہے عزت و جاہ
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو

نار سے نور کی جانب اُسے لائی تقدیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بحل کی تقصیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا
اللہ اللہ حرِ صفدر و غازی کا نصیب
ہجر میں لطف ملاقات کا دوری میں قریب
صدقے ہو جائے اسے عشقِ دلی کہتے ہیں

آیا کس شان سے کعبہ کی طرف چھوڑ کے دیر
حق نے لکھدی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر
ذکرِ خیر اُس کے موے پر بھی ہوے جاتے ہیں
کفر کی راہ سے کارہ تھا جو وہ نیک طریق
تھے تو لاکھوں پہ کسی کو بھی ہوئی یہ توفیق
اوجِ دیندار کو بے دین کو سدا پستی ہے

ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ در تھا حُر
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا
حُر پہ کیا فضل خدا ہو گیا اللہ اللہ
خضرِ قسمت نے بتا دی اُسے فردوس کی راہ
بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر
تکیۂ زانوے شبیر ملا وقتِ اخیر
جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا
جانِ محبوبِ الٰہی ہے جسے فرمائے حبیب
وہی کام آتے ہیں محسن کے جو ہوتے ہیں نجیب
اُس کو دنیا میں سعیدِ ازلی کہتے ہیں

کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اُسے غیر
فتنہ و شر سے بچا ہو گیا انجام بخیر
عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں
کس بشاشت سے ہوا رہبرِ ایماں کا رفیق
خُلق طینت میں ہے جن کے وہی ہوتے ہیں خلیق
اصل جس تیغ کی اچھی ہے وہی کستی ہے

کیوں نہ بالیدہ ہو اُس کا چمنِ جاہ و جلال
ہو گیا فاطمہؑ کے باغ میں آتے ہی نہال
کھِل گیا غنچۂ دل عذر جو منظور ہوے
حُر کہاں اور کہاں احمدِ مرسل کا خلف
دِل صفا ہو گیا سینے میں تو پاے یہ شرف
نیک جو ہر ہیں دل پر وہی چھَن جاتے ہیں
وصفِ حُر میں ہی زباں معترفِ عجز و قصور
جب ہوئی مستعدِ جنگ سپاہِ مقہور
غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
کیا کہوں شانِ جوانانِ جنودُ اللہ
باندھی شیروں نے صفِ جنگ میانِ جنگاہ
واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا
ہو گئے سرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبیؐ
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماں دار بڑھے
اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوے اعدا سے امام
تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجّت کو تمام
سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو

جس کو سرسبز کرے خود اسد اللہ کا لال
وہ ثمر پاے کہ پہونچے نہ جہاں دستِ خیال
صورتِ برگِ خزاں دیدہ گنہ دور ہوے
بخت نے دَیر سے پہونچا دیا کعبہ کی طرف
جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں تو ملا دُرِ نجف
جب خدا چاہے تو بگڑے ہوے بن جاتے ہیں
آمد آمد کی بہادر کا سنو اب مذکور
مہرِ افلاکِ امامت نے کیا رن میں ظہور
ای فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے
کوئی ہم صورتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ
چمنِ خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
بڑھ کے عباسؑ نے یاں سبز علم کھول دیا
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
یکہ تازوں نے کیا شورِ مبارز طلبی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی
نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوے اسوار بڑھے
بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں
ای سپاہِ عرب و روم و ری و کوفہ و شام
پسرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو میرا کلام
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

یہ صدا سنتے ہی خود رُک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبل و غا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش
کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش
چھیڑنا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رُعبِ فرزندِ نبی سُرمۂ آواز ہوا

کم ہوا غلغلۂ فوج ستم جب یک بار
یوں گہربار ہوئے شہ کے لبِ گوہر بار
صف کشی کس پہ ہے یہ ای سپہ نا ہنجار
قتلِ سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار
وطن آواروں پہ یہ قہر ہے کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم بُرا کرتے ہو
شمعِ ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائے گا

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں
میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں
مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

قلزمِ عزّ و شرف کا دُرِ شہوار ہوں میں
سب جہاں زیرِ نگیں ہے وہ جہاندار ہیں ہم
آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں
ورثۂ احمدِ مختار کا مختار ہوں میں
بخدا دولتِ ایمان اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پہ ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغِ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

تنگ آئے گا تو رُکنے کا نہیں پھر شبیر
ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ بُرّاں شمشیر
شیر ہوں لختِ دلِ غالبِ ہر غالب ہوں
میں جگر بندِ علی ابنِ ابی طالب ہوں

[illegible] ... گلا سے آواز بند ہو جاتی ہے ۱۲ ... مرقع مراد ... ۱۲ ... شباب جمع شبیب یعنی جوان ۱۲

مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش اُمت کا خیال
تھام سکتا تھا لجامِ فرسِ برق مثال
گفتگو میں سپر اس کی جو نہ ہم ہو جاتے
غیظ سے ہونٹھ چباتے تھے علیؑ کے دلدار
اُگلی پڑتی تھی جگر بندِ حسنؑ کی تلوار
چلتی تلوار تو جنگل نہ وبالا ہوتا
تھا یہ بپھرا ہوا عباسؑ مرا شیر جواں
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جاں
کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جائے
گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں
پوچھ لو حُر تو ہے موجود عیاں راچہ بیاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
زیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر
میں نے عباسِ دلاور سے کہا گھبرا کر
کرمِ ساقیِ کوثر کو دکھا دو بھائی
رہ نہ جائے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب
سقے مشکیزوں کے منہ کھول کے آپہنچے شتاب
چین آیا نہ مجھے بے انھیں آرام دیئے
تھی یہی فصل یہی دھوپ یہی گرم ہوا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا
بھایؤ آؤ جو پانی کی طلبگاری ہے

روک لیتا مجھے رستے میں یہ تھی حُر کی مجال
پوچھ لو دیکھا ہے اُس نے مرے شبرؑ کا جلال
ہاتھ اک وار میں پہونچوں سے قلم ہو جاتے
نیمچے تولتے تھے عون و محمد ہر بار
میں نے جب سر کی قسم دی تو رُکے وہ جرار
پھر نہ حُر خلق میں ہوتا نہ رسالا ہوتا
سینۂ حُر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں
رحم لازم ہے ہمیں ہم ہیں امامِ دو جہاں
کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے
کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
اسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں
منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی
مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ میں پانی کے کدھر
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی
چھاگلیں جلد منگاؤ مرا دل ہے بے تاب
متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کارِ ثواب
تھا جو اک جام کا پیاسا اُسے دو جام دیئے
ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حُر کے رفقا
سقے بھر بھر کے کٹوروں کو یہ دیتے تھے صدا
چشمۂ فیضِ حسینؑ ابنِ علیؑ جاری ہے

آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں
شکر کرنے لگی تر ہو گئی ہر خشک زباں
شور تھا ابنِ یداللہ نے جاں بخشی کی

ایک دن وہ تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ
چشمِ اُمید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ
ہر مسلمان پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے

کئی طفل اُن میں ہیں کم سن کہ موئے جاتے ہیں
پانی پانی جو وہ کرتے ہیں تو شرماتے ہیں
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
اُن کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے

ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احسان ان کا
خشک و تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا
جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہووے گا

یہ ابھی ہاتھ اُٹھا کر جو دعا فرمائیں
حق سے جس شے کے طلبگار ہوں فوراً پائیں
مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں
اس مجرم کی گنہگار کی اُمید ہیں یہ

فرس و اشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں
دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

کہ اسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

دم اُکھڑتا ہے مرا جب اُنھیں غش آتے ہیں
پاس دریا ہے پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

عمر سعد نے کی مڑ کے رُخِ حر پہ نگاہ
محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ
سخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

ابرِ رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا
اے خوشا حال جو غربت میں ہو مہماں ان کا
جو اُدھر ہو گا خدا اُس کی طرف ہووے گا

جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
جامِ کوثر ہمیں فردوس سے حوریں لائیں
یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق جن کا ہے

ہیں سخی ابنِ سخی بات پہ سر دیتے ہیں
یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں
ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعدِ شریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر
سُن چکا ہوں میں کہ مضطر ہی کئی راتوں سے
نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج
تخت بخشا ہی محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہی

کیا کسی حور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال
قصرِ یاقوت میں پہونچا جو ترا رنگ ہی لال
دفعتاً حقِ نمک کو بھی فراموش کیا
میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہی تیری
ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہی تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہی

خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
حاکمِ شام ہی جابر وہ سزا دے گا ضرور
سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
نفع اُس امر میں کیا جس میں ہو مردم کا ضرر
شجرِ قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر
الفتِ زلف سے بھی پیچ میں تو آوے گا

بدر پیشانیِ سرور کا جو ہی سر میں خیال
سب میں ہو جاوے گا انگشت نما مثلِ ہلال
عشقِ رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جاوے گا
یہ تو ہی صاف طرفدارئیِ شہ کی تقریر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیر
الفتِ شاہ ٹپکتی ہی تری باتوں سے

سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہی آج
جن کو سمجھا ہی غنی دل ہیں وہ خود ہیں محتاج
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہی
مِل گیا سایۂ طوبیٰ کہ جو ایسا ہی نہال
کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہی رال
کیا تجھے بادۂ تسنیم نے بے ہوش کیا

قرۃ العینِ محمدؐ پہ نظر ہی تیری
جسم خالی ہی اِدھر جان اُدھر ہی تیری
تو نے فرزندِ یداللہ سے سازش کی ہی
لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
گر تجھے دار پہ کھینچے تو کچھ اُس سے نہیں دور
زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوئیں گے

آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر
سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہی اس کا ثمر
خالِ رُخ دیکھا تو گھر خاک لے لگ جائے گا
تو اسی ماہ میں نقصان ترا ہوے گا کمال
تیر و شمشیر ہی ابرو کی محبت کا مآل
منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ابھی کٹ جائے گا

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرّانا کیا
ننگ کی بات ہی دشمن کی طرف جانا کیا
ابھی لے جائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے

حُر پکارا کہ زباں بند کر او ناہموار
ابنِ زہرا ہی جگر بندِ رسولِ مختار
اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہی

وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لائے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رتبے پائے
الفتِ آل میں مرئے تو خوش اقبالی ہی

اسفلوں سے ہی محبت تجھے او سفلہ مزاج
جس کو کاندھے پہ محمدؐ کے ملی ہی معراج
کیوں ترے سامنے مُکروں کہ نہیں بخشا ہی

باغ جو مجھ کو دکھایا اُسے کیا جانے گا تو
مجھ کو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں خوشرو
نام کوثر کا نہ لے تو نہ مجھے جوش آتا ہی

عزتِ دیں شرفِ کون و مکاں ہی شبیر
سنگ پانی ہو وہ اعجاز بیاں ہی شبیر
مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے

کیا میں اور کیا وہ ریاست گئی کیا میرے عیال
واں کی املاک و زراعت کا ہو کیا مجھ کو خیال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہی مجھ کو

لب پہ ہر مرتبہ بے کس کی ثنا لانا کیا
ہو نبیؐ یا کہ وصی جنگ میں شرمانا کیا
خلد ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زہ ہاتھ لگے

قابلِ لعن ہی تو اور وہ تیرا سردار
میرا کیا منہ جو کروں مدحِ امامِ ابرار
آپ قرآن میں خدا اُن کی ثنا کرتا ہی

تین سو آیہ ہوں تعریف میں جن کی آئے
اپنا محبوب و ولی جس کو خدا فرمائے
سنگ ہی اُن کی محبت سے جو دل خالی ہی

خاک پا اُس کا ہوں میں ہی جو سرِ عرش کا تاج
میرے آقا سا سخی کون ہی کونین میں آج
ہاں مجھے شاہ نے فردوسِ بریں بخشا ہی

راحتِ روح ہی جس باغ کے ہر پھول کی بو
کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو
اُنھیں چھینٹوں سے تو بے ہوش کو ہوش آتا ہی

جانِ زہرا کی محمدؐ کی زباں ہی شبیر
جان کیوں ہو نہ ادھر جانِ جہاں ہی شبیر
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے

جب کے آفت میں پھنسی احمدِ مختار کی آل
یاں ہوئی جاتی ہی سادات کی کھیتی پامال
خانہ بربادیِ شبیرؑ کا غم ہی مجھ کو

دولتِ حاکمِ دون پر ہی ترا دار و مدار
دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار
کیا مجھے دار پہ کھنچے گا وہ ظالم غدّار
خوابِ غفلت ہی اُسے میرا ہی طالع بیدار
کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبےٰ کا مرے فرق پہ سایا ہوگا

ہی سرافراز سدا عاشقِ پیشانیِ شاہ
سجدے کیجے کہ ہی بیتِ ابرُوں کی بیت اللہ
عشق آنکھوں کا ہی مردم کے لیئے نورِ نگاہ
ہی وہ یوسف جسے ہی مصحفِ رخسار کی چاہ
عاشقِ لب کو خدا لعل و گہر دیتا ہی
وہ دہن چشمۂ کوثر کی خبر دیتا ہی

خالِ رخسار نہیں گوے سعادت ہی یہ
مجھ سے مجرم کے لیئے مُہرِ شفاعت ہی یہ
ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہی یہ
بخدا سلسلۂ بخششِ اُمت ہی یہ
شبِ معراجِ رسولِ دو جہاں سمجھا ہوں
اُس کے ہر تار کو میں رشتۂ جاں سمجھا ہوں

وصفِ دنداں میں رہے جس کی زباں گوہر بار
موتیوں سے دہن اُس شخص کا بھر دے غفار
شوق میں سیبِ ذقن کے جسے آئے نہ قرار
حورِ غرفوں سے دکھائیں اُسے رنگِ رخسار
دم بدم چاہنے والوں کے لہو گھٹتے ہیں
یہ گلا وہ ہی گلے جس کے لیئے کٹتے ہیں

صدقے اُس سینہ پہ ہیں عاشقِ صافی سینہ
خاک اُس دل پہ جو اُس سینے سے رکھے کینہ
حق نما ہی تو جہاں میں ہی یہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا
فیض پاتا ہی وہ جس دل میں جلا ہوتی ہی
چشم کو اُن کی زیارت سے جلا ہوتی ہی

پاؤں یہ وہ ہیں کہ ان پاؤں کو جو ہاتھ لگائے
تو سر دست سرافرازیِ کونین وہ پائے
گردِ نعلینِ مبارک جو اثر اپنا دکھائے
توتیا ہوئے خجل کحل جواہر شرمائے
صدقے کردیں گے سر ان پاؤں پہ ہم ایسے ہیں
دوشِ احمد پہ رہے جو یہ قدم ایسے ہیں

عملِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس
یہی کونین کا مالک ہی یہی راس رئیس
کیا نہ مجھے دے گا ترا حاکمِ ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہدے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو نجاتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار
غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہی
حُر نے نعرہ کیا یا حیدرِ صفدر مدد دے
زوجِ زہرا مدد دے نفسِ پیمبر مدد دے

تنِ تنہا ہی غلام اور بہت اظلم ہیں
مل گئی راہِ خدا واہ رے اقبال ترا
جُرمِ ماضی ہوے سب عفو خوشا حال ترا
مرد ہی جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہووے
منتظر ہیں ترے سب فوجِ حسینی کے جواں
راہ تکتی ہیں تری دیر سے حورانِ جناں

فوجِ قدسی تری ہمّت کی ثنا کرتی ہی
تو بہشتی ہی یہ کافر ہیں کنشتی ای حُر
دیکھ اب صورتِ حورانِ بہشتی ای حُر
غضب اللہ کا شبّیر کی ناراضی ہی
اور بالیدہ ہوا سن کے یہ مژدہ وہ ہژبر
اب تو اس فوج میں اک دم کی بھی تعویق ہی جبر

ہاں اُٹھا باگ جو شیدائے شہِ عالی ہی
سن کے یہ باگ جو لی اسپ سبکتاز اُڑا
کیا اُڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اُڑا
باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہی

سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آے اک بار
پانوں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار
لو طرفدارِ حسینؑ ابنِ علی جاتا ہی
وقتِ امداد ہی یا فاتحِ خیبر مدد دے
بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد دے

آئی آواز کہ ای حُر ترے حامی ہم ہیں
پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جلد جا جلد کہ شائق ہی مرا لال ترا
ہاں بہادر تری توفیق زیادہ ہووے
درِ فردوس پہ مشتاق کھڑا ہی رضواں
شورِ کوثر پہ ہی شبّیر کا مہماں ہی کہاں

فاطمہ آج ترے حق میں دعا کرتی ہی
مٹ گئی سب ترے اعمال کی زشتی ای حُر
کس تلاطم میں بچی ہی تری کشتی ای حُر
پنجتن تجھ سے ہیں راضی تو خدا راضی ہی
دلِ بیتاب پکارا کہ نہیں طاقتِ صبر
قعرِ دوزخ ہی مسلماں کے لیے صحبتِ گبر

فوجِ اللہ و نبیؐ میں تری جا خالی ہی
ڈر سے رنگِ عُمرؑ شعبدہ پرواز اُڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اُڑا
غل تھا دربارِ سلیماں میں پری جاتی ہی

لہ یعنی ابن سعد ۱۲

کیا ڈو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند
کٹتے تھے شرم سے وہ لے کے جو دوڑے تھے کمند
کیا سبک سوے چمن بادِ بہاری پہونچی
ہاں ہوے علمِ امامت سے شہِ دیں آگاہ
میرے لشکر کی طرف ہے رخ حرِّ ذی جاہ
جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار
پار دریاے خطا سے مری کشتی ہو جاے
کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ
ابرِ رحمت کی طرف جا یہ صدا دیتے ہیں

تیرے دامن کے نثار اے مرے آقاے جلیل
دل خنک ہوے جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل
نہ وزیروں میں یہ ہمت نہ شہنشاہ میں ہے
خلق ہیں آپکے وال کے کرم ہیں مشہور
مجھ سے ہیں باگ پکڑ لینے پہ آزردہ حضور
یہ تو کیونکر کہوں میں لائقِ تعزیر نہیں

اے مددگار و معین الضعفا ادرکنی
پانوں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا ادرکنی
دنبجیے حر کو سند نار سے آزادی کی

حر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گردِ سمند
یہ چھلاوا تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند
ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہونچی
ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ
سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اُس شخص کی راہ
میرا مہمان مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

الغیاث اے جگر و جانِ رسولِ مختار
عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیضِ غفّار
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جاے
مدد اے نوحِ غریباں مرا بیڑا ہے تباہ
شور کرتا ہوں کہ بتلاے کوئی جاے پناہ
سب ترے دامنِ دولت کا پتا دیتے ہیں

رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبدِ ذلیل
جان آجائے جو مولا ئے دو عالم ہوں کفیل
سب مرے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے
بات ہیں بخش دیئے سیکڑوں بندوں کے قصور
بخش دیجے تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور
مگر اسود سے زیادہ مری تقصیر نہیں

اے خبر گیر گروہِ غربا ادرکنی
ہاتھ باندھے ہوں ہیں اے عقدہ کشا ادرکنی
آئیے جلد خبر لیجئے فریادی کی

میرے اعمال میں ہر چند سراسر ہی بدی
آپ ہیں مالکِ سرکارِ جنابِ احدی
جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ
ایک یہ خستہ تن اور درپئے جاں لاکھ حریف
چھوڑ کر آپ کی سرکار کہاں جائے نحیف
ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہِ اُمم
شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں
حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر
میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو

کس کے کیوں باندھا ہے ہاتھوں کو میں ہوتا ہوں خجل
بھائی آ مجھ سے بغلگیر تو ہو کھول کے دل
جرم سب محو کیے حق نے ترے دفتر سے
حُر پکارا بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمّی یا شاہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے یہ راہ
مہر ذرّہ ہے جو ہو نیّرِ تاباں ہو جائے

کون مقداد تھے سلمان و اباذر تھے کون
شور عالم میں جو ہے مالکِ اشتر تھے کون
انھیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے
ہوں گنہگارِ خدائے ازلی و ابدی
اے خداوندِ جہاں خذ بیدی خذ بیدی
آپ کا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ

اے سلیماں کہیں پامال نہ ہو مورِ ضعیف
کیجئے اب نظرِ لطف کہ ہوتا ہے خفیف
نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے
جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اُس دم
لے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
مجھ کو عباسِ دلاور کے برابر ہے تو
سہل کر دیں اُسے گر اور کوئی ہو مشکل
غافر و راحم و توّاب ہے ربِ عادل
آج پیدا ہوا گویا شکمِ مادر سے

قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہے آگاہ
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے
آپ فرمائیں کہ عمّارِ دلاور تھے کون
اے خداوندِ جہاں حضرت قنبر تھے کون
اسی سرکار کے خلعت سے سرافراز ہوئے

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب — دے کسی شخص کو بندے ہیں یہ مقدور ہے کب
اس مسبب کی عنایت کے سہارے ہیں سبب — وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
اپنے کیسے سے نہ دام اور درم دیتے ہیں — جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

لاکھ ہاتھ اُس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد — ہم اُسے بھولیں تو بھولیں اُسے ہر وقت ہے یاد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد — شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد
وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اُس کا — کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اُس کا

جس قدر اُس سے طلب کیجیے خوشنود ہے وہ — صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
ہاتھ پھیلائے جو سو بار تو موجود ہے وہ — بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے — یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ امم — ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا اللہ رے کرم
راس و چپ قاسم و اکبر تھے نئے شان و حشم — سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباسؑ علم
دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے — رفقا سایہ میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام — بولے عباس کمر کھول اب اے نیک انجام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام — عرض کی حر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے — آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی اُمنگ — ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ — شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
لیکن ایسا نہ ہو بچہ کوئی بے جاں ہو جائے — پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قرباں ہو جائے

شہ نے فرمایا کہ دشوار ہے فرقت تیری — مجکو مر کر بھی نہ بھولے گی محبت تیری
وا دریغا ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری — خیر فردوس میں ہو جائے گی دعوت تیری
آج رتبہ ترا خیل شہدا میں ہوگا — شب کو تو صحبت محبوب خدا میں ہوگا

تجھ پہ مخفی نہیں ہفتم سے جو کچھ ہے مرا حال
قحط پانی کا ہے اس دشت میں گندم کا ہے کال
سب کو ایذا عوضِ آب و غذا ملتی ہے

حُر نے رو کر سرِ تسلیم جھکایا بہ ادب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشقِ سلطانِ عرب
دم بدم یاں سے جو آوازِ بکا جاتی تھی

حُر چلا فوجِ مخالف پہ اُڑا کے توسن
وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی چتون
دوشِ سرِ دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے

زورِ بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے
خودِ رومی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی

نیزۂ حُر کی سناں پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ
قبضۂ تیغ پہ رکھے تھا سرِ عجز پناہ
قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے

رن میں جب شہ کی طرف سے حرِ دیندار آیا
غل ہوا سیدِ مظلوم کا غمخوار آیا
تتقِ نور سرِ راہ نظر آتا ہے

آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور
ای خوشا رُتبۂ فیضِ قدمِ پاکِ حضور
صحبتِ اہلِ ولا دل کو جلا کرتی ہے

راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہلِ ضلال
نانِ جو کا بھی ہے ملنا کسی قسم پہ ہیں محال
دودھ اصغر کو نہ عابد کو دوا ملتی ہے

شہ نے یہ حال کہا آنکھوں سے رونے لگے سب
شاہ بولے کہ عجب دوست چھٹا ہائے غضب
گریۂ آلِ محمدؐ کی صدا آتی تھی

چوکڑی بھول گئے جس کے تگاپو سے ہرن
ہاتھ میں تیغ سپر دوش پہ بر میں جوشن
کاکلِ حور کے سب پیچ کھلے جاتے ہیں

دستِ فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
چشمِ خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہے زباں مارِ سیاہ
آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردۂ ماہ
تیر ترکش کے نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

کس بشاشت سے اُڑاتا ہوا رہوار آیا
جاں نثارِ خلفِ حیدرِ کرّار آیا
جلوۂ قدرتِ اللہ نظر آتا ہے

پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا پر اب اور ظہور
غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعتِ نور
مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہے سرکار شہ عالم ہیں
ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں
یہ وہی حُرِ جری ہے جو ابھی تھا ہم میں
تن ہے خوشبو رُخ گلرنگ تر و تازہ ہے
خاکِ نعلینِ مبارک کی عجب غازہ ہے
مہر ذرہ ہے جہاں چہرۂ روشن ایسا
چاندنی جس سے کرے کسبِ ضیا تن ایسا
حرز ہو بازوے داؤد کا جوشن ایسا
ہوش پریوں کے اڑے جاتے ہیں توسن ایسا
گلشنِ دہر میں لو بادِ بہاری آئی
قاف میں غل ہے سلیماں کی سواری آئی

حُر پکارا کہ بجا کہتے ہو لاشک لاریب
دامنِ حضرتِ شبیر نے ڈھانپے مرے عیب
دولتِ دیں سے نہ دامن مرا خالی ہے نہ جیب
بارک اللہ کی دیتا ہے صدا ہاتفِ غیب
فیض پاکر پئے شمشیر زنی آیا ہوں
یاں سے محتاج گیا واں سے غنی آیا ہوں

مجھ کو خورشید کیا نورِ خدا کی ضو نے
نور بخشا پسرِ فاطمہؓ کے پرتو نے
بخت پلٹے ہیں سکندر کے غلام تو نے
گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے
دورِ دوراں آج سے میرا ہے زمانہ میرا
کبھی خالی نہیں ہووے گا خزانہ میرا

رُخِ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے
ل کے آیا ہوں منہ اپنا قدمِ حضرت سے
نور وہ ہے جسے دیکھیں نظرِ رغبت سے
ولے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے
مجھ کو بھی دیکھ کے بیدار نہیں ہوتے ہو
ہے غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو

جانِ سلطانِ رسالت کو غنیمت جانو
پسرِ شاہِ ولایت کو غنیمت جانو
نورِ خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
قمرِ برجِ امامت کو غنیمت جانو
ساتھ اس کے برکت خلق سے اُٹھ جائے گی
پھر جو ڈھونڈھو گے یہ دولت تو نہ ہاتھ آئے گی

ایک سیّد کے مٹا دینے میں ہے کونسا نام
اس ہوا پر ہو کہ بجھ جائے چراغِ اسلام
گر ہو دانا تو کہو بد ہے کہ ہے نیک کلام
خوش نما کب ہے وہ تسبیح نہ ہو جس میں امام
شکرِ احسانِ جنابِ احدی کرتے ہیں
پیشوا سے کہیں پیرو بھی بدی کرتے ہیں

یہ سخن سُن کے پُکارا پسرِ سعدِ شریر
ہاں طرفدارِ شہِ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر
لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہِ کثیر
فاتحہ پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر
حُر کا منہ سُرخ ہوا فوجِ ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

رعد تھرّا گیا نعرے جو سُنے ضیغم کے
استخواں کانپ گئے زیرِ زمیں رستم کے
تہہ و بالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے
برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبتِ جنگ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیرقیں گر گئیں ہاتھوں سے نشاں چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا
غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کفلایا
شیر سا فوجِ مخالف پہ جھپٹ کر آیا
روند ڈالا اُسے دم میں جسے سرکش پایا
اُس کا قاتل تھا جو دشمن شہِ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغِ حُرِ ذی جاہ چلی
آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کِس کرشمہ سے وہ لیلیِ ظفر راہ چلی
گہہ بڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ کھائی نہ گئی
سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جس طرف دیدۂ جوہر سے نظر کرتی ہے
پل نہ گزرے کہ صفیں زیر و زبر کرتی ہے
چشم ہر چند کہ پتلی کو سپر کرتی ہے
ہے وہ طرار کہ آنکھوں میں یہ گھر کرتی ہے
اُس کے افسوں سے جو ساحر ہو وہ جل جاتا ہے
سحر پریوں کا اسی طرح سے چل جاتا ہے

پھونکے بجلی کو یہ اُس آگ کی ہے پرکالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا
برچھیاں چل گئیں اُس پر جسے دیکھا بھالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا
اُس کے پانی میں کفِ ناریہ گھولا ہے
باڑھ ہے یا ملک الموت نے منہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
جس پہ چاہی تھی نہ بے جان کیے پھرتی تھی
گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اُس کا
ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اُس کا
شور تھا دیکھیے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یارب نہ وبالا ہوں میں
کس میں ہے یہ جو تڑپے برِ فلک میری ہے
نہ تھمی سنگ سے وہ اور نہ رکی آہن سے
نہ اُٹھی اُس کی کڑی ضرب کسی جوشن سے
جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش اسلوب گئی
کثرتِ جوہرِ ذاتی سے وہ گو جال میں تھی
تھی چمک جانے میں بجلی تو پری چال میں تھی
کہیں دم لینے کی مہلت تھی نہ بسمل کے لیے
صید کرنے کو جدھر صورتِ شہباز آئی
غل ہوا شہپرِ شاہیں کے تلے قاز آئی
گرچہ قبضے میں لیے تھی اُسے پر چھوڑ دیا
آب نے آتشِ سوزاں کا اثر دکھلایا
باڑھ نے جادۂ صحرائے سفر دکھلایا
تیغ کہتی تھی درِ فتح کی مفتاح ہوں میں

دست و پا صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی
دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اسی گھاٹ گئی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اُس کا
جو بڑھا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اُس کا
اس قدر جلد تو سیفی بھی نہیں چلتی ہے
سر اُٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہی یہ یا ہوں میں
تیغ کرتی تھی اشارا یہ چمک میری ہے
ہاتھ اُڑا دیتی تھی پہونچوں سے تو سر گردن سے
چل گئی بادِ مخالف جدھر آئی سن سے
خوں کے دریا میں ہر اک کشتیِ تن ڈوب گئی
پر تڑپ صورتِ ماہی وہی ہر حال میں تھی
کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی
تھی جگر کے لیے برچھی تو چھری دل کے لیے
لاکھ تڑپا وہ نہ بچ جان لیے باز آئی
اُڑ گیا طائرِ دل اور نہ آواز آئی
تھا زبس صیدِ زبوں کاٹ کے سر چھوڑ دیا
تاب نے مرگِ مفاجات کا گھر دکھلایا
گھاٹ نے آئنۂ فتح و ظفر دکھلایا
قول قبضہ کا یہ تھا قابضِ ارواح ہوں میں

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید
برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید
نہ بچا تارِ نفسِ خلق میں جینے کے لیئے
کئی حملے کیئے پیہم جو کمانداروں پر
چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سو فاروں پر
جل کے خرمن ہوئیں یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا

نیزۂ فوجِ ستمگار تھے دیکھے بھالے
گرچہ تھے جان لڑائے ہوئے لڑنے والے
جیسے سواروں کے پرے جنگ پہ تل جاتے تھے
الفِ گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب میں دال
کبھی برچھی کی انی تھی تو کبھی تیر کی بھال
ضرب کھوک کے دشمن کو فنا کرتی تھی

شور تھا آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے
ضرب میں فرد ہے یہ زور میں لاثانی ہے
زور تھا تجھ میں نہ ایسا نہ وغا کی طاقت
کہہ کے یہ فوج میں پھر تشنہ جگر ڈوب گیا
لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا
تھا کبھی شیر سا پھرا ہوا شمشیروں میں

گہہ چھپا اور گہے نکلا وہ مہ برجِ شرف
گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف
جتنے مجروح تھے دم اُن کے نکل جاتے تھے
حُر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید
جامۂ کفر کے پرزے بھی ہوئے قطع و برید
چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لئے

چل گئے تیر ملامت کے جفا کاروں پر
رُخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا
دم میں اُس شیر نیستاں نے قلم کر ڈالے
آفتِ مرگ کو سر سے کوئی کیونکر ٹالے
بند سب ناخنِ شمشیر سے کھل جاتے تھے

تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال
کبھی تلوار کبھی خنجرِ برّاں کبھی ڈھال
دم بدم فوجِ ستمگر بھی تنا کرتی تھی
جل بُجھے کشتیِ تن خون میں طوفانی ہے
کہتا تھا حر یہ فقط قوتِ ایمانی ہے
سب ہے یہ سبطِ پیمبرؐ کی دعا کی طاقت

ورطۂ قلزمِ آفت میں گُہر ڈوب گیا
کشمکش تھی کہ عرق میں گلِ تر ڈوب گیا
کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں
گہے اس صف میں در آیا گہے وہ دی وہ صف
گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف
شیر بھی نامِ علیؑ سُن کے دہل جاتے تھے

نخل تھرّاتے تھے سب بچ رہا تھا جنگل
سر کی جاتی تھی زمیں رن کی غضب تھی ہلچل
کوند جاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل
منہ کے بھل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل
حشر برپا تھا سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس لوٹتے تھے

بڑھ کے فرماتے تھے عباس نہ ہے عزت و جاہ
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبرِ شاہ
کہتے تھے ابن حسنؑ واہ حُرِ غازی واہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے ماشاءاللہ
اپنی جاں بازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مُسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

حیف جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی
سامنے چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی
لاکھ خونریز اُدھر اور ادھر تنہائی
باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی
آگیا موت کے پنجہ میں نہ کچھ دیر لگی
فرق پر گرز لگا دوش پہ شمشیر لگی

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے
رکھ دیا شیر نے قربوس پہ سر نہوڑا کے
علی اکبرؑ نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے
گر ہو ارشاد تو مہماں کو بچاؤں جا کے
خادمِ حضرت زہرا و علیؑ گرتا ہے
خاک پہ اب وہ سعیدِ ازلی گرتا ہے

شاہ رونے لگے یہ سنتے ہی مہماں کی خبر
ہوگئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
علی اکبرؑ سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر
حُر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نورِ نظر
کس سے اس وقت کہوں ہے جو قلق مجھ پر ہے
لاش اُٹھاؤں گا کہ مہماں کا حق مجھ پر ہے

عرض کی حضرتِ عباس نے جاتا ہے غلام
جوشِ رقت میں کہا شہ نے نہیں اے گلفام
میری الفت میں ہوا قتل حرِ نیک انجام
دوست کیسے جو برے وقت میں ہم آئے نہ کام
اُس پہ جب سخت گھڑی ہوگی تو کام آویں گے
لاش کیا قبر میں مہماں کی ہم جاویں گے

اُس کے لاشے پہ نہ جائیں یہ مروت سے ہے دور
اُس سے ہم شاد ہوئے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور
قصرِ خلد اُس کو دکھائیں کہ ہوئے عفو قصور
سرخرو جاتا ہے دنیا سے وہ خالق کے حضور
ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا
میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جنابِ شبیر
واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حرِ با توقیر
دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھاگے بے پیر
پہونچے لاشے پہ امامِ دو جہاں وقتِ اخیر
چمنِ ہستی مہمان کو اُجڑتے دیکھا
ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا

گر کے لاشے کے برابر یہ پکارے سرور
میرے مہمان و مددگار و معین و یاور
گرز کیا تجھ کو لگا ٹوٹ گئی میری کمر
گر پڑا گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھ کو خبر
دوست کے ہجر میں کب دوست کو چین آیا ہے
کھول دے چشم کو بھائی کہ حسین آیا ہے

واہ رے حُر جری میں تری ہمت کے فدا
اس کو کہتے ہیں محبت اسے کہتے ہیں وفا
ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا
بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تو نے کیا
حق تعالےٰ چمنِ خلد میں گھر دے بھائی
اس ریاضت کا خدا تجھ کو ثمر دے بھائی

حُر کو جو تکا کے حبیب ابنِ مظاہر نے کہا
آپ بے تاب ہیں اے حُرِ جری ہوش میں آ
دیکھ دیدارِ جگر بندِ جنابِ زہرا
کوچ درپیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا
دم رُکا کا ہے تو آقا سے وصیت کر لے
نزع میں نورِ الٰہی کی زیارت کر لے

کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیرِ غلام
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام
بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہِ عرش مقام
اے خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام
حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
تو تو حسین کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا

نیم وا چشم سے حُر نے رُخِ مولا دیکھا
زہے سر زانوے شبیر کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُر جری کیا دیکھا
عرض کی حُسنِ رُخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار
شاخ سے میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار
حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہرِ نثار
ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر تیرا ہے
دیکھ اے شاہ کے مہمان یہ گھر تیرا ہے

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
خلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
ننگے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف

لاش اُٹھا کر شہِ دیں خیمہ کے در پر آئے
غل ہوا خیمۂ عصمت میں کہ سرور آئے
دُخترِ فاطمہ سامانِ عزا کرنے لگی

شاہ چلّائے کہ اے زینب و ام کلثوم
ماں ہے یاں اس کی نہ خواہر تمھیں ہے معلوم
اجر ہوگا تمھیں اشکوں سے جو منہ دھوؤگی

کہہ دو کبرا سے کہ ماتم کے لیے کھولے وہ سر
جاں گزا بین کرے بانوے تفتیدہ جگر
غل ہے فریاد کا آوازِ بکا آتی ہے

میری جانب سے کہو لاش پہ آئیں سجّاد
یہ وصیت مری شیعوں کو ہے رکھیں اسے یاد
جس عزا خانہ میں وہ تعزیہ میرا رکھیں

ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
لو بر آمد ہوئے شبیر بھی پدر کے ہمراہ
دیکھیے آپ کے نانا کی سواری آئی

پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ بازپسیں
لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
کچھ اُڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
چل بسے حُرِّ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

پاؤں مہماں کے سنبھالے علی اکبر آئے
پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوئے سر آئے
فضّہ پردے کے اُدھر آ کے بکا کرنے لگی

ہم بھی مظلوم ہیں مہمان بھی مرا ہے مظلوم
کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم
اُس کو یوں روؤ کہ جس طرح مجھے روؤ گی

روئے نادان سکینہؓ اسے عمو کہہ کر
ہم ادھر لاش پہ ماتم کریں تم روؤ اُدھر
سن لو ماں کے بھی رونے کی صدا آتی ہے

بعد مرنے کے ہو تا روح مرے دوست کی شاد
نام حر سن کے کریں آہ و فغان و فریاد
اُس کا ماتم بھی اسی بزم میں برپا رکھیں

دوست کے دوست کا غم دوست سدا کرتے ہیں
حق محبت کا وفادار ادا کرتے ہیں
فاتحہ دیتے ہیں سامان عزا کرتے ہیں
غیر مرجاتا ہی گھر میں تو بُکا کرتے ہیں

تھا یہ وہ دوست کہ جاں اس پہ فدا ہوتی ہی
فاطمہؓ اپنا پسر کہہ کے اُسے روتی ہی

سُن کے یہ شور ہوا حُر دلاور ہی ہی
ای مددگارِ جگر بندِ پیمبرؐ ہی ہی
خوں میں سب تر ہی تر اروے منوّر ہی ہی
تشنۂ بیکس و مظلوم کے یاور ہی ہی

ادھر آنا تھا کہ تیری اجل آئی بھائی
گھر میں سادات کے دعوت بھی نہ کھائی بھائی

بس انیسؔ اب یہ دُعا مانگ کہ ای رب عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد
رونے والے شہِ والا کے رہیں خلق میں شاد
اُن کے سایہ میں برومند ہوان کی اولاد

عشرہ ماہ عزا نالہ کشی میں گزرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

رُباعی

افسوس زمانے کا عجب طور رہا
کیوں چرخ کہن آہ نیا دور رہا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمیں اور فلک اور رہا

رُباعی

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہی
ممکن ہی نگیں طبل و علم ملتا ہی
عنقا کو گرو سُرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہی

مرثیہ (۶)

جب حر کو ملا خلعت پر خونِ شہادت
مسنو جب رحمت تھا وہ مفتونِ شہادت
بے سر دیے ہرگز یہ مہم سر نہیں ہوتی
یہ مرتبہ بے شکر گزاری نہیں ہوتا
بے فیض یہ چشمہ کبھی جاری نہیں ہوتا
راحت بھی اُٹھائی ہے جب آزار ملے ہیں

غل تھا کہ یہ اچھوں کی رفاقت کا ثمر ہے
ایمان فقط نخلِ ولایت کا ثمر ہے
مولا جسے چاہیں وہ گناہوں سے بری ہو
اک جا تھے حر و شمر یہ عالم میں ہے مشہور
وہ ہوتا ہے جو ہوتا ہے اللہ کو منظور
دولت کو نہ حشمت کو نہ آرام کو دیکھے

اللہ کے محبوب کے دربار میں پہونچا
بے رنج و خلش گلشنِ بے خار میں پہونچا
مالک نے لیا اُس کو اسے شاہِ عرب نے
رتبہ یا اسے زہرا کا پسر واہ ری قسمت
طوبےٰ کے تلے خلد میں گھر واہ ری قسمت
کیا جلد گیا سوے ارم وارِ فنا سے

جنّت میں گیا رالضِ گلگونِ شہادت
جان بیچ کے پایا دُرِ مکنونِ شہادت
ہاتھ آئی وہ دولت جو میسّر نہیں ہوتی
یہ اوج بجز رحمتِ باری نہیں ہوتا
کم قدر کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوتا
غواص کو اکثر دُرِ شہوار ملے ہیں

جنّت گلِ زہرا کی محبّت کا ثمر ہے
سرسبزیِ حر باغِ ریاضت کا ثمر ہے
کھیتی یہ ہر اول کی ہے کیونکر نہ ہری ہو
کیا شانِ خدا ہے کہ یہ مغفور وہ مقہور
انسان رہے حق کی طرف اپنے بمقدور
آنکھیں وہی رکھتا ہے جو انجام کو دیکھے

سر دے کے یداللہ کی سرکار میں پہونچا
وہ نار میں یہ خلد کے گلزار میں پہونچا
رحمت نے اسے گھیر لیا اس کو غضب نے
زانوے حسین اور وہ سر واہ ری قسمت
دُنیا سے یہ راحت کا سفر واہ ری قسمت
سوکھا جو پسینہ بھی تو جنت کی ہوا سے

خواہش یہ ہر اک حور کی تھی حر ادھر آئے
یہ صاحب اقبال و تہوّر ادھر آئے
لہراتا تھا کوثر بھی کہ یہ ڈر ادھر آئے
فرماتے تھے حیدر یہ بہادر ادھر آئے
مشتاق ملاقات کے سب چھوٹے بڑے تھے
محبوب خدا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑے تھے

فرماتی تھی زہرا مرے غمخوار کو لاؤ
جلدی مرے پیارے کے مددگار کو لاؤ
تعظیم سے تکریم سے جرّار کو لاؤ
لاؤ مرے آگے حرِ دیندار کو لاؤ
بابا نہ کفن وال تو یہاں شاد کروں گی
میں حلۂ جنت اُسے امداد کروں گی

حوروں کا وہ میووں کے طبق سامنے لانا
در پردہ اشارے۔ کہ ہماری طرف آنا
کوثر ہے وہ۔ منظور ہے گر پیاس بجھانا
اس قصر جواہر سے کہیں اور نہ جانا
جو کہئے وہ کریں۔ فخر ہے خدمت شہدا کی
ہم سب ہیں کنیزیں پسر شیر خدا کی

حقا کہ یہ رتبہ شہِ ذی جاہ نے بخشا
ایماں کا شرف فاطمہؓ کے ماہ نے بخشا
طالب تھا وہ جس کا وہی اللہ نے بخشا
بخشا اُسے خالق نے جسے شاہ نے بخشا
جنّت ادھر آئی جدھر آیا قدم اُن کا
کر دیتا ہے انساں کو فرشتہ کرم اُن کا

ای حرؔ دلاور تری تقدیر کے صدقے
رتبے کے فدا عزت و توقیر کے صدقے
مہماں کے تصدّق شہِ دلگیر کے صدقے
اُس صحبت ذی قدر کی تاثیر کے صدقے
ناکام کا یوں کام ملاقات میں بن جائے
برسوں کا جو بگڑا ہو وہ اِک بات میں بن جائے

اب یاں سے رقم کرتا ہے یوں راوی صادق
جب قتل ہوا حُر سا مددگار موافق
پھر فوج یہ برسانے لگے تیر منافق
مر جانے پہ اک دل ہوئے سب شاہ کے عاشق
ایک ایک سے پہلے تھا خریدار اجل کا
سر کٹتے تھے گرم تھا بازار اجل کا

یوں جاتے تھے میدان شہادت میں وہ جرّار
جس طرح کہ بچھڑی ہوئی بلبل سوئے گلزار
خود روکتے تھے فرق یہ جب آتی تھی تلوار
باران کرم جانتے تھے تیروں کی بوچھار
برچھی جو لگی نخل شہادت میں پھل آیا
جان آ گئی جس وقت پیام اجل آیا

زخموں کو عطائے صمدی جانتے تھے وہ
آزار کو لطف احدی جانتے تھے وہ
جینے کو مقدّر کی بدی جانتے تھے وہ
مرنے کو حیاتِ ابدی جانتے تھے وہ
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ محمد کی ثنا تھی
دو روز کی پیاس اُن کیلئے آبِ بقا تھی

قربانِ تولائے حبیب ابن مظاہر
یکساں صفتِ مہرِ مبیں باطن وظاہر
عصیاں سے بری طیّب و پاکیزہ وطاہر
جاں باز جہاں دیدہ فنِ جنگ سے ماہر
سر ہلتا تھا پیری سے قدِ راست میں خم تھا
اس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

رعشا تھا کہ قابو میں نہ تھے دستِ نکوکار
پر ایک میں محکم تھی سپر ایک میں تلوار
جب شہ کی طرف تیر لگاتے تھے ستمگار
یہ بڑھ کے اُسے روکتے تھے سینے پہ ہر بار
بھائی مرے پاس آؤ یہ فرماتے تھے حضرت
جب تیر اُنھیں لگتا تھا تڑپ جاتے تھے حضرت

جب ایسے رفیقوں کا بھرا ہو گیا خالی
بھرتا تھا دمِ سرد وہ کونین کا والی
پھر تھا کوئی مولا کا نہ ہمدم نہ موالی
لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرورِ عالی
بے تاب تھے اس طرح ہر اک دوست کے غم میں
جیسے کوئی روتا ہی برادر کے الم میں

لاشوں کے اُٹھانے سے نہ پائی تھی فراغت
جو نوک کے نیزوں کو بڑھے اہل شقاوت
مولا کے یگانوں نے کیا عزم شہادت
لٹنے لگی زہرا و محمّد کی بضاعت
سیدانیوں کا دودھ جو بی بی کے پلے تھے
جلادوں کی تلواریں تھیں اور اُن کے گلے تھے

لاکھوں سے لڑے حضرتِ عباس کے بھائی
حملوں میں دکھائی شہ مرداں کی لڑائی
سب شانِ پدر بیٹوں نے جعفر کے دکھائی
مسلم کی جو میراث تھی فرزندوں نے پائی
لاکھوں میں پھر اس شان سے شاہِ دو جہاں تھے
دو طفل جلو میں فقط اور تین جواں تھے

دو طفل وہ جو تین شب و روز کے پیاسے
زینب کے پسر شیرِ الٰہی کے نواسے
خود اپنی شہادت کے طلب گار خدا سے
بے تاب کہ کیوں رہ گئے پیچھے شہدا سے
جینے کی ہماری جو خبر پائیں گی امّاں
لاشے بھی یقیں ہے کہ منگوائیں گی امّاں

قاسمؑ حسنؑ سبز قبا کا مہِ تاباں
عباسِ علیؑ چشم و چراغ شہ مرداں
ہم شکل نبیؐ نورِ نگاہ شہِ ذی شاں
زینبؑ کے پسر جعفر و زہراؑ کے دل و جاں
تاباں نظر آتا تھا قمر پاس قمر کے
پانچوں یہ جری چاند تھے شبیر کے گھر کے

ایک ایک جری ملکِ شجاعت کا شہنشاہ
بچپن میں اولوالعزم کہ اَلعظمۃُ للہ
ذی قدر سرافراز و وفاکیش دل آگاہ
شیر اُن کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ
پیدا یہ تہوّر سے کہ لاکھوں ہیں تو کیا ہیں
دعویٰ تھا ہر اک کو کہ ہمیں شبیر فدا ہیں

کھولے ہوئے رایت کوئی تولے ہوئے شمشیر
بے تاب کہ تلوار کے چلنے میں ہے کیوں دیر
فاقوں میں نہ بر دست کیے لاکھوں سے نہ ہوں زیر
بیٹھے ہیں پلے جو اسد اللہ کے وہ شیر
جز سجدۂ حق سر کبھی اُن کے نہ جھکے تھے
یہ قبلۂ عالم کا ادب تھا جو رُکے تھے

اس وقت عجب غم تھا شہِ جن و بشر کو
نہ روح کو راحت تھی نہ آرام جگر کو
کھو سکتے تھے بھائی کو نہ اکبر سے پسر کو
نہ عون و محمد کو نہ شبّر کے قمر کو
میوے تھے سب اک باغ کے پھول ایک چمن کے
وہ بھائی کا بیٹا تھا یہ بیٹے تھے بہن کے

فرماتے تھے موت آئے تو چھُٹ جاؤں الم سے
یا رب مرا گھر ہی انھیں جرّاروں کے دم سے
بچھڑیں نہیں ان سے یہ جدا ہوئیں نہ ہم سے
کٹ جائے گلا جلد کہیں تیغِ دو دم سے
ہاتوں سے یہ محبوب گنوائے نہیں جاتے
داغ اب تو یہ بندے سے اُٹھائے نہیں جاتے

ناگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا
پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
مُنہ سُرخ ہوا غیظ سے ہم شکل نبی کا
رایت بھی بڑھا فوجِ رسولِ عربی کا
حیدر کے نواسوں کی بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو اُسے سیدِ ابرار
بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار
کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار
ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار
بے تاب ہیں دل جان لڑائی میں پڑی ہے
اے نورِ خدا ذرّہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر پہلے گئے قاسمؑ و اکبرؑ
شبّرؑ کی وہ تصویر یہ ہم شکلِ پیمبرؐ
مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں
بسمل جو ہوئے مسلمِ مظلوم کے پیارے
امّاں نے کہا ہوگا کہ ابتک نہ سدھارے
قاصر ہیں جو توقیرِ شہادت نہیں ملتی
حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادہ
نانا تو علیؑ جعفرِ طیّار سے دادا
شیروں کی طرح بیشۂ حیدرؑ میں پلے ہیں
وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی
نانا تھے جو کرّار تو جرّار ہیں ہم بھی
ہے جوشِ وفا عمر کے پیمانے بھرے ہیں
ہم آپ سے مرنے کے لئے جا نہیں سکتے
بے حکم جو مطلب ہے اُسے پا نہیں سکتے
پیچھے رہے اوروں سے یہ تقدیر ہماری
ہم دونوں غلام اکبرؑ و اصغرؑ کے ہیں یا شاہ
امّاں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ
پوچھیں گی خفا ہوکے تو کیا اُن سے کہیں گے
عورت ہیں پہ خو بو شہِ مرداں کی ہے ساری
تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمہاری
کس کام کے پھر سر جو تصدّق نہ کروگے

یا شاہ ہمیں دودھ نہ پھر بخشیں گی مادر
توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقے ہوں اُن پر
ہم ان کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں
ہم خیمے میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی
سن کم ہیں پہ ہمّت ہے جوانوں سے زیادہ
ہم ڈھونڈھتے ہیں صبح سے فردوس کا جادہ
تلواروں سے ہم کھیلے ہیں اس گھر میں پلے ہیں
دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی
سر دے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں
زخمِ تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے
آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے
ہاتھ آپ کے ہے عزّت و توقیر ہماری
الفت کو بس اب دل سے اٹھا دیجئے واللہ
بنتِ اسدِ حضرتِ باری ہیں وہ ذی جاہ
آزردہ ہوئیں وہ تو کہیں کے نہ رہینگے
شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری
تب دودھ میں بخشوں گی جو عزّت سے مروگے

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند — حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضامند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند — کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند
تنہائی کا دکھ فاطمہ کا لال سہے گا — لاشے کے اُٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا

اکبر کو تو ہمشیر نے میں نے تمھیں پالا — ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا
اب کون ہے غربت میں مرا تھامنے والا — دل کا کوئی ارمان بھی تم سے نہ نکالا
دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں — دنیا سے اجل لے چلی شادی کے دنوں میں

دونوں سے یہ فرما کے ادھر روتے تھے شبیرؑ — چپ بیٹھی تھی رانڈوں میں ادھر شاہ کی ہمشیر
سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر — محجوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر
میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے — اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشے پہ لاشا — اُن کے لیئے اوروں کی لڑائی ہے تماشا
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا — باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا
رُکتے ہیں ولا اور کہیں روکے سے کسی کے — وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علیؑ کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ابھی کیا — نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا
میدان کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہِ والا — آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصے کی نہیں جا
سُن لیجیے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے — حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے — جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے — کیا جانئے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں — اب وہ مرے فرزند نہیں دونوں کی ماں ہوں

یہ ذکر تھا فضہ جو خبر لے کے یہ آئی — فریاد کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی — اے بنتِ علیؑ روتے ہیں آپ کے بھائی
بچے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو — دو بھانجے ماموں سے جدا ہوتے ہیں لوگو

فضہؓ سے یہ سُننا تھا کہ بس رونے لگے سب
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب
بہتر ہی جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں

بچے ہیں لڑائی کے نہیں ننگ سے واقف
فوجوں سے نہ آگہ نہ فنِ جنگ سے واقف
بوٹا سے ہیں قد بھی نہیں کچھ ایسے بڑھے ہیں

دہ سالہ و نہ سالہ تھے نکلے جو وطن سے
بچے مرے کمزور ہیں فاقوں کے محن سے
محسوب ہوں ان فدیوں میں علی ابن ولی کے

بانو نے کہا دیکھ لو پھر اُن کو بلا کر
اصرار کیا سب نے تو گردن کو جھکا کر
صدقے گئی کچھ کام ہی یاں آ کے سدھارو

فضہؓ گئی اور خیمے میں لائی انھیں ہمراہ
قدموں پہ گرے ہاتھوں کو جوڑے جو وہ ذیجاہ
ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں

چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ مادر
جاتا تھا وہاں ایک کے بعد ایک دلاور
کس سے کہیں آقا پہ جو کچھ رنج و تعب تھا

لاشوں کا وہ آنا وہ ہجومِ الم و یاس
آزردہ نہ ہوں آپ ہیں تنہا ہی شہِ ناس
جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گرد پھرے ہیں

اور خاک پہ سجدے کو جھکیں حضرتِ زینبؓ
عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہی یا رب
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں

نیزے کے نہ تلوار کے ہیں ڈھنگ سے واقف
دونوں میں نہیں ایک بھی چو رنگ سے واقف
گھوڑوں پہ تو وہ پہلے پہل آج چڑھے ہیں

بو دودھ کی آتی ہے ابھی ان کے دہن سے
دھڑکا ہے کہ گھبرا کے چلے آئیں نہ رن سے
تو ان کی مدد کر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

فرمایا نہیں آئیں گے خود برچھیاں کھا کر
فرمایا کہ اچھا کوئی کہہ آئے یہ جا کر
جانے ہو تو شکلیں مجھے دکھلا کے سدھارو

آئے صفتِ مہر لرزتے ہوئے دو ماہ
لپٹا کے گلے کہنے لگی بنتِ ید اللہ
لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصے نہ خفا ہوں

ہر دم تھے اسی فکر میں ہم دونوں برادر
ہر دوست سے مل ملکے گلے روتے تھے سرور
اس وقت میں رخصت طلبی ترکِ ادب تھا

جرأت نہ پڑی عرض کی تھے گرچہ بہت پاس
جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرتِ عباس
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اس وقت گرے ہیں

خوش ہو کے کہا ماں نے کہ شاباش دلیرو
ہاں چاہیئے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو
توقیر تمھاری ہو مری ناموری ہو
دادا کو جو پوچھو تو علمدار پیمبرؐ
نانا سا تو عالم میں نہ تھا کوئی دلاور
یوں سب ہیں پہ سرتاج دلیروں کے تمھیں ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے
کیا شہرۂ خیبر شکنی بُت شکنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور
ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذیقدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ
مر کر نہ ہٹے قابلِ احسنت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی
آفت میں حواس اُن کے بجا ہوتے ہیں پیارو
تیروں کی مہم بات میں سر کرتے ہیں صفدر
تلواروں میں سینوں کو سپر کرتے ہیں صفدر
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی

نانا نے تمھارے درِ خیبر کو جو توڑا
ہر وار میں بچتا تھا نہ اسوار نہ گھوڑا
تھرّاتے تھے کفار تزلزل میں زمیں تھی

اب دیر نہیں خوب سدھارو مرے شیرو
ڈو شیر ہو مل کر عمر و شمر کو گھیرو
سر دونوں کے لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو
ہاتھوں کے عوض جن کو خدا نے دیئے دو پر
کرّار کی جرات تو سُنی ہو گی مکرّر
ماں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تمھیں ہو

جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
جو بات پہ سر دے وہ سخاوت کا دھنی ہے
چھپتے نہیں لاکھوں میں جوانمرد کے تیور
جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
جو کھیت میں سرسبز ہو سادات وہی ہے

گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
جرّاروں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو
آقا کے دلِ پاک میں گھر کرتے ہیں صفدر
عزت پہ بزرگوں کی نظر کرتے ہیں صفدر
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

مانندِ سپر ہاتھ سے اس در کو نہ چھوڑا
خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا
تھا زور تو یہ اور غذا نانِ جویں تھی

جب دستِ یداللہ میں تیغ دوسر آئی
چھلٹے یہ اِدھر فوج پہ نصرت اُدھر آئی
پڑھتے ہیں وہ کلمہ جو مسلماں ہوئے دبکے
خندق کی وغا عمرو سیہ کار کی وہ دھوم
رد کر کے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
اِک ضرب میں گرز نہ مغفر تھا نہ سر تھا
جس وقت ظفریاب ہوئے حیدرِ کرّار
فرمایا نبی نے یہ بہ اعلان و بہ تکرار
سر فتح کا تھا پاؤں پہ خالق کے ولی کے
واری یونہیں تم بھی مرے کام آؤ تو جانوں
اِن چھاتیوں پر زخمِ سناں کھاؤ تو جانوں
جرّار ہو سب حال سے محرم ہیں تمہارے
ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی سرد ہوا پا کے نہ جانا
ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے
جس پانی کو ترسے اسداللہ کا پیارا
عاقل کے لیئے کافی و وافی ہی اشارا
وہ کام ہو جس کام میں کوثر پہ گزر ہو
بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے
جرأت کو جلالت کو لڑائی کو نہ چھوڑے
جو امر کہ مشکل ہی وہ دشوار نہ ہوگا

بس قبضۂ قدرت میں یکا یک ظفر آئی
بعد آپ پھرے فتح کی پہلے خبر آئی
اب تک تو سر اُٹھتے نہیں کفارِ عرب کے
تھرّاتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم
جھپٹا اسد آہو پہ یہ سب کو ہوا معلوم
خندق کے ادھر لاش سرِ نحس اُدھر تھا
اک ہاتھ میں سر عمرو کا اور ایک میں تلوار
افضل ہی دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار
جبریلِ امیں چومتے تھے ہاتھ علی کے
آقا کی اطاعت کو بجا لاؤ تو جانوں
لڑ بھڑ کے جب اِس فوج سے مرجاؤ تو جانوں
مجکو بھی یہ دھڑکا ہی کہ سن کم ہیں تمہارے
پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا
صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا
میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے
کیوں جاؤ اُدھر نہر پہ کیا کام تمہارا
گر آبِ بقا ہو تو مناسب ہی کنارا
دم بھر کے لیئے کیوں عرقِ شرم میں تر ہو
دونوں ہیں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
ہمّت کو مروت کو بھلائی کو نہ چھوڑے
اک دل ہوئے جب دو تو کوئی چار نہ ہوگا

اِک بھائی لڑے بڑھکے جو ہاتھ ایک کا تھک جاے
بلوا جو پھر اس پر ہو تو بہ بہرِ کمک جاے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جاے
گر صف ہو تو پسپا ہو پرا ہو تو سرک جاے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوے جانا
ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے میں قربان گئی برچھیاں کھانا
لازم ہے وہ ہمت کہ معرّف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

دونوں نے کہا ہو گا یہی فضلِ خدا سے
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مر جائیں گے پیاسے
ہم اور نہیں کوئی۔ علی کے ہیں نواسے
غافل نہ رہیں آپ غلاموں کی دُعا سے
کچھ ہم سے نہ تلوار سے نہ ڈھال سے ہو گا
جو ہو گا وہ سب آپ کے اقبال سے ہو گا

ارشاد نہ حضرت کا بجا لائیں تو مجرم
بھولے سے بھی دریا کی طرف جائیں تو مجرم
ڈر جائیں تو بے قدر جو ہٹ جائیں تو مجرم
بڑھ بڑھ کے نہ شمشیر و سناں کھائیں تو مجرم
مر جائیں گے دُنیا میں سدا کون جیا ہے
دودھ آپ کا ہم دونوں غلاموں نے پیا ہے

جیتے ہیں تو بے صف شکنی ہم نہ رہیں گے
مجبور ہیں سینوں میں اگر دم نہ رہیں گے
سر کاٹیے گا پاؤں جو محکم نہ رہیں گے
لڑکے ہیں جوانوں سے مگر کم نہ رہیں گے
جینا کسی صورت ہمیں مطلوب نہیں ہے
اب کیا کہیں خود اپنی ثنا خوب نہیں ہے

چھوٹے تو ہیں کیا منہ سے بڑی بات نکالیں
ان سینوں پہ کھدے کوئی سو نیزوں کی بھالیں
سیدانیاں ایسی جنھیں آغوش میں پالیں
تلواروں میں روکیں گے وہی سینوں پہ ڈھالیں
ہم جینے پہ مرتے نہیں مرنے کو جیے ہیں
سینے ہمیں کس واسطے خالق نے دیے ہیں

مختار ہیں یوں آپ سزا دیں کہ خفا ہوں
ہوتے ہیں مکدّر کہیں دل جن کے صفا ہوں
وہ نام پہ کیونکر نہ مریں جو شرفا ہوں
تب وقت ہے غصّہ کا جو وعدے نہ وفا ہوں
کیا زیست پھر اُن کی جنھیں ماں باپ نہ بخشیں
تیور بھی جو میلے ہوں تو دودھ آپ نہ بخشیں

ایسے تو نہیں ہم جو شجاعت نہ دکھائیں
سب نام کریں اور ہمیں جرات نہ دکھائیں
نانا کی گر شان و جلالت نہ دکھائیں
مصحف کی قسم آپ کو صورت نہ دکھائیں
خندق ہو تو لاشوں سے زمیں پاٹ کے مر جائیں
تیغیں نہ چلیں گر تو گلا کاٹ کے مر جائیں

جب کہہ چکے یہ جوشِ شجاعت میں وہ گلرو
آنکھوں سے ٹپکنے لگے رُخساروں پہ آنسو
لپٹا کے گلے کہنے لگی زینبِ خوش خو
اللہ یہ غصہ ہے کہ بل کھاتے ہیں گیسو
لڑنا ہے تمھیں فوج سے مطلوب لڑو گے
لو روؤ نہ معلوم ہوا خوب لڑو گے

صدقے میں ارادوں کے مرے شیر جوانو
اے بے وطنو فاقہ کشو تشنہ دہانو
اب غیظ سے ٹھہراؤ نہ کہنا مرا مانو
ماں کہتے تھے پر اب مجھے تم خادمہ جانو
یہ فصل لڑائی کی نہیں کھیل کے دن ہیں
میں اس لیے کہتی ہوں کہ چھوٹے ابھی سن ہیں

شیر اُس کے ہو تم شیر ہے جو بنتِ اسد کا
ہر جس نے کیا معرکہ صفین و اُحد کا
دُنیا میں بڑا نام ہے تم دونوں کے جد کا
ماں صدقے گئی وقت ہے ماموں کی مدد کا
ایک ایک جسے دشتِ ستم لاشوں سے بھر دے
اللہ تمھیں لشکر اعدا پہ ظفر دے

لو بخشدیا دودھ سدھارو مرے پیارو
اُلجھے ہوئے گیسو تو سنوارو مرے پیارو
میلی ہے یہ پوشاک اُتارو مرے پیارو
دولھا تو بنا لوں مرے پیارو مرے پیارو
خوش ہونگی میں تب گھوڑوں پہ جب آن چڑھو گے
شادی ہے بڑی آج کہ پروان چڑھو گے

فرما کے یہ لیں دونوں کے چہروں کی بلائیں
اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں
فرمایا کہ رخصت جنھیں ہونا ہو وہ آئیں
لو بی بیو سب آؤ تو بچے مرے جائیں
رن میں یہ برات اپنی دکھانے کو چلے ہیں
دونوں دُلھنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں

سب بیبیاں آئیں جو کلیجوں کو سنبھالے
تسلیم کو جھک جھک گئے وہ نازوں کے پالے
جس وقت چلے خیمے سے وہ گیسوؤں والے
در تک گئی ماں خاکِ عزا فرق پہ ڈالے
ڈیوڑھی سے جو دونوں دُرِ یکتا نکل آئے
نزدیک تھا یہ ماں کا کلیجہ نکل آئے

خیمے سے برآمد ہوئے زینبؑ کے جو دلبر
دیکھا کہ حسینؑ ابن علیؑ روتے ہیں در پر
بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی وہ صفدر
منہ کر کے سوئے چرخ پکارے شہِ بے پر
یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کی پلے ہیں
بچے بھی تری راہ میں مرنے کو چلے ہیں

کہہ کر یہ سخن دونوں کو گھوڑوں پہ چڑھایا
دونوں نے شرف پایۂ معراج کا پایا
بجلی کا سب انداز سمندوں نے دکھایا
دوڑے کہ دکھائی نہ دیا دھوپ میں سایا
ثابت نہ ہوا ایک پہ کیا ہو گئے دونوں
جنگل کو جو دیکھا تو ہوا ہو گئے دونوں

ایک ایک سے جاندار گراں قدر سبک رو
وہ جست وہ کاوے وہ طرارے وہ دوا دو
کیلوں کی وہ تابش وہ ہر اک نعل کا پرتو
تاروں میں دکھاتے تھے چمک چار مہِ نو
اک چاند تھا وہ جو سُمِ توسن کا نشاں تھا
بالائے زمیں عالمِ بالا کا سماں تھا

شکلیں بھی پری جرأت و سرعت کے علاوہ
دو گام تھا جن کے لیے سو کوس کا دھاوا
قد ایک سے شکل ایک سی اور ایک سا کاوا
یہ گشت میں بجلی وہ رواروی میں چھلاوا
شوخی میں یہ آہو تھا اگر طیر تھا وہ بھی
یہ بادیہ پیما تو فلک سیر تھا وہ بھی

ہاں کبک تو یہ رنگ یہ انداز دکھائے
قائل ہوں جو طاؤس یہ پرواز دکھائے
جانیں جو پری چال میں یہ ناز دکھائے
آہو یہ طرارے یہ تگ و تاز دکھائے
ہوگا وہی لاریب تصوّر میں جو ہے
دعویٰ ہے تو آئیں یہی میداں یہی گو ہے

تھم تھم کے بھی چلنے میں سب انداز ہوا کا
لڑنے میں سماں برق کا اُڑنے میں ہما کا
پائے اُنھیں مقدور یہ کب پیکِ صبا کا
نہ وہم کا واں دخل نہ ہے فہم شعرا کا
یہ عجز ہے تعریف جو کرتا نہیں کوئی
باندھیں کیسے مضموں تو ٹھہرتا نہیں کوئی

یوں ذہن میں آتے ہی نکل جاتے ہیں سن سے
جس طرح نسیم آ کے نکل جائے چمن سے
جرأت میں فزوں شیر سے سرعت میں ہرن سے
آگاہ ہیں وہ جرأت و سرعت کے چلن سے
نعل اُن کے سروہی سے چلے فوجِ ستم پر
پڑتے تھے قدم دونوں کے دلدل کے قدم پر

گھوڑوں کو اُڑاتے ہوئے پہونچے جو بہادر
اک شور ہوا کون سے دریا کے ہیں یہ دُر
کیا جانیے کیا نام ہیں ان کے اب و جد کے
پیشانیاں خورشیدِ جہاں تاب سے بہتر
دانتوں کی صفا گوہرِ نایاب سے بہتر
ابرو وہ نہیں پیشانیِ ذی قدر کے نیچے
حیراں ہیں عدو حسن پہ اور دونوں کے سن پر
آنکھیں وہ کہ پریوں کی نظر پڑتی ہے جن پر
گیسو و رُخ خوں میں بھرے رنج کی جا ہے
آنکھوں کی سیاہی پہ فدا نرگسِ شہلا
ہیں پختگی دل کبھی ان کا نہیں دہلا
تلوار چلی پھر گئی چتون جدھر ان کی
دل بر ہیں دلیروں کے حسینوں کے حسیں ہیں
شیریں سخن اس طرح کے عالم میں نہیں ہیں
جملے ہیں وہی صاف وہی شرط وجزا ہے
شرمندہ ہے شمشاد بھی قد معتدل ایسے
مختوم ہیں خط خال کے نقطے سجل ایسے
سطریں ہیں یہ سب گیسوؤں کے بال نہیں ہیں
وہ چاند سے سینے کہ وفا کا ہے گھر اُن میں
شیروں کا ہے بیٹہ کہ دل اُن ہیں جگر اُن میں
خود جن میں ہو دریا یہ سفینے نہیں دیکھے

فوجِ ستم آرا ہوئی سب غرق تحیر
لڑکے ہیں پہ اللہ رے اقبال و تہور
تیور سے یہ پیدا ہے کہ بچّے ہیں اسد کے
رخسارۂ رنگیں گلِ شاداب سے بہتر
چہروں کا عرق موتیوں کی آب سے بہتر
ہیں دو مہِ نو بال سے اک بدر کے نیچے
ابرو وہ کمانیں ہیں کہ قرباں ہیں سب ان پر
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہے رات نے دن پر
دو بدر نشیں چار شش و پنج کی جا ہے
یہ عینِ شجاعت ہے کہ ہے معرکہ پہلا
بے تیغوں کے کھیلے کوئی بچہ نہیں بہلا
غصّے میں سرو ہی سے سوا ہے نظر ان کی
گویا یہ دہن خاتمِ قدرت کے نگیں ہیں
یہ طرفہ حلاوت ہے کہ باتیں نمکیں ہیں
تقریر میں سب مصحفِ ناطق کا مزا ہے
رکھ دیتے ہیں سینوں کو سنانوں پہ دل ایسے
دیکھے ہیں کسی چشم کی پتلی نے تل ایسے
مہریں یہ خطِ حسن پہ ہیں خال نہیں ہیں
عدل و کرم و صنعت و علم و ہنر اُن میں
اسرار جنابِ احدی کے گہر ان میں
اس طرح کے سینے تو کسی نے نہیں دیکھے

مضموں ہیں سر دست یہ ہاتھوں کی ثنا کے
ناخن ہیں ہر دونوں کے ہر عقدہ کشا کے
قبضے پہ اگر ہاتھ رکھیں غصّے میں آ کے
دم بھر میں ہلا دیں طبقے ارض و سما کے
ہی کونسا سرکش جو یہاں پست نہیں ہی
ان سے کوئی دُنیا میں زبردست نہیں ہی

بت کعبہ سے جن سب نے نکالے یہ وہی ہیں
رُکتے نہیں جن لوگوں کے بھالے یہ وہی ہیں
ہی فتح و ظفر جن کے حوالے یہ وہی ہیں
خیبر کے جو ہیں توڑنے والے یہ وہی ہیں
پروانے ہیں شمعِ حرمِ لم یزلی پر
قبضہ انھیں لوگوں کا ہی شمشیرِ علی پر

فوجیں نہیں ٹھہریں یہ جہاں جم کے لڑے ہیں
ہاتھ ان کے تو فولاد کے پنجے سے کڑے ہیں
چھوٹے ہیں جو اس گھر کے وہ جرّار بڑے ہیں
دیکھو یہ کہ بپھرے ہوئے دو شیر کھڑے ہیں
یہ پاؤں ہٹاتے نہیں ہیں جنگ پہ چڑھ کے
سر کٹنے پہ بھی گرتے ہیں تو کھیت سے بڑھ کر

ناگاہ یہ بڑھ کر پسرِ سعد پکارا
ای شیر دو نام و نسب کیا ہی تمھارا
تلواریں پکڑ کر یہ پکارے وہ دل آرا
خالق نے ہمارے لیئے دُنیا کو سنوارا
خورشیدِ زمیں تاجِ سرِ عرشِ بریں ہیں
پہلا یہ شرف ہی کہ غلامِ شہِ دیں ہیں

دادا ہی شہنشاہِ دو عالم کا مددگار
سردارِ جہاں فخرِ عرب جعفرِ طیار
وہ شُقّۂ طرازِ علمِ احمدِ مختار
آلودہ رہی خوں میں جس شیر کی تلوار
ہاتھوں کے عوض جن نے سر دست لیے ہیں
اللہ نے پر اُن کو زمرد کے دیے ہیں

نانا اسد اللہ مددگارِ دو عالم
دیندار نمودار جہاں دارِ دو عالم
سلطانِ قضا منتظمِ کارِ دو عالم
سرتاجِ فلک جیغۂ دستارِ دو عالم
سب امر اہم عقل کی میزان میں تلے تھے
عقدے وہ ہوئے حل جو کسی سے نہ کھلے تھے

بازوئے نبی دستِ خدا نفسِ پیمبر
طیّب و زکی و طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن و فاتحِ خیبر
سرتاجِ عجم میرِ عرب حیدرِ صفدر
اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہی
گہوارے میں اژدر کا دہن چاک کیا ہی

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے
وہ زور کہ ایمان کو قوت ہوئی جس سے
دیکھے اُسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے
کانپا کیا روم و عرب اک تیغِ دو سر سے
دینداروں کو امن اُس نے دیا فتنہ و شر سے
کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ مٹے گا
اللہ رے اوج و شرف و عزت و مقدار
خالق کا ولی احمدِ مرسل کا مددگار
پاتے ہیں اشارے میں شفا کور و کر اُس سے
ہم دونوں نواسے ہیں اُسی فیض رساں کے
دکھلائیں گے جوہر تمھیں تیغِ دو زباں کے
تم یہ نہ سمجھنا کہ ید اللہ نہیں ہیں
سُن کر یہ رجز فوج کے سردار پکارے
تابندہ ہیں افلاکِ شرافت کے ستارے
حیدر کی طرح صاحبِ شمشیر ہیں دونوں
یہ سُن کے کیا سب نے لڑائی کا سرانجام
برچھی کہیں چمکی کہیں خنجر کہیں صمصام
یوں آتے تھے سب ٹوٹ کے فوج آتی ہے جیسے
اُس شور میں شاباش کھڑے تھے وہ دلاور
کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا کہ برادر
وہ کہتا تھا تکیہ ہے عنایاتِ احد پر

وہ حکم کہ خورشید کو رجعت ہوئی جس سے
وہ ضرب بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے
بہتر کوئی شاہد درِ خیبر سے نہیں ہے
گذری سرِ مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
ضرب اُس کی نہ رُکی گئی جبریل کے پر سے
پر حشر تک اُس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا
دشمن کو بھی تھا فضل ہیں جس کے نہیں انکار
خاکِ کفِ پا سرمۂ چشمِ اولوالابصار
بینا ہے وہی جس کو ہے چشمِ نظر اُس سے
فرزند ہیں ہمشیرِ شہِ کون و مکاں کے
بڑھ بڑھ کے اُلٹ دیں گے پرے فوجِ گراں کے
ہم شیر تو ہیں گر اسد اللہ نہیں ہیں
اے قوم یہ شبیر کے ہیں بھانجے پیارے
ہاں بھر لے طلا سے وہ سپر جو انھیں مارے
لڑکا انھیں سمجھے نہ کوئی شیر ہیں دونوں
کھلنے لگے ہر صف میں علمہائے سیہ فام
بدلی کی طرح جھوم کے آئی سپہ شام
بچوں پہ صفیں آتی تھیں موج آتی ہے جیسے
پروا تھی نہ مطلق کہ یہ فوج آتی ہے کس پر
دیکھیں تو ذرا آپ قریب آگیا لشکر
آنے دو اجل ان کو لیے آتی ہے زد پر

آتا ہی تھا شکار آپ سے جس دم طرفِ شیر
دانستہ وہ کرتا ہی جھپٹنے میں ذرا دیر
جاتے ہیں کہاں اب تو ہر آئے نہ شمشیر
جس جا ہیں صفیں ہوتے ہیں لاشوں کے وہیں ڈھیر
کُھل جائے گا جب نیمچے کھنچیں گے کمر سے
عرصہ فقط اتنا ہی کہ سبقت ہو ادھر سے

تھوڑے ہیں اُبل پڑتے ہیں وہ جو ہیں تنگ ظرف
جب گرم ہوا مہرِ درخشاں تو کہاں برف
سر جائے پہ آئے نہ شجاعت پہ کوئی حرف
اس نحو سے عمر اپنے بزرگوں کی ہوئی صرف
ہاتھ اپنا چلے گا تو جگہ پا کے چلے گا
ٹھوکر وہی کھائے گا جو گھبرا کے چلے گا

تقریر ادھر یہ تھی کہ تیر آئے اُدھر سے
پیغام وغا لیکے سفیر آئے اُدھر سے
سب موت کے حلقے میں اسیر آئے اُدھر سے
دو بچوں پہ دو لاکھ شریر آئے اُدھر سے
اس بھیڑ پہ بھی بند تھے دہشت سے دم اُن کے
بڑھ بڑھ کے ہٹے جاتے تھے پیچھے قدم اُن کے

برچھی لیئے انبوہ سواروں کا جب آیا
شہزادوں نے رانوں میں سمندوں کو دبایا
اک شور ہوا غیظ رحیموں کو اب آیا
وہ نیمچے بجلی سے جو چمکے غضب آیا
آخر وہ جری تختِ دلِ ضیغمِ دیں تھے
سر تھے صفِ اول کے کہیں جسم کہیں تھے

بس پھر تو دھنسے فوج میں وہ شیرِ درندہ
تلواروں سے ڈر ڈر کے چھپے مردوں میں زندہ
آہو سے بھی چالاک تھے اسپانِ دوندہ
مرتے ہیں جو بجلی تھے تو اُڑتے ہیں پرندہ
مانندِ براقِ نبوی عرش سما تھے
گھوڑے نہ کہو اوجِ سعادت کے ہما تھے

مارا اُنھیں چن چن کے جو تھے فوج میں چیدہ
رہواروں سے پامال تھے سرہائے بریدہ
باہم تھے کمانداروں سے دونوں جو کشیدہ
بدکیش و خطاکار تھے سب زخم رسیدہ
سہمے ہوئے تھے تیر کہ آفت تھی جہاں پر
پیکاں نہ سرے پر تھا نہ چلّہ تھا کماں پر

خالی تھی جو یہ صف تو پریشان وہ پرا تھا
جنگل ستم ایجادوں کی لاشوں سے بھرا تھا
رنگ اُڑ گئے تھے چہروں سے لشکر پہ ڈرا تھا
تھرّاتا تھا وہ ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے
تیغیں بھی نیاموں میں چُرائے تھیں دم اپنے

وہ مرگیا تلوار اُٹھا کر جسے ڈانٹا
گلہائے جراحت کو عجب حسن سے بانٹا
اب تک نہ ہوا باغِ جہاں میں نہیں دیکھی
تلوار نے چھوٹے کی نیا رنگ دکھایا
حیرت ہوئی وہ زور دمِ جنگ دکھایا
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا
وہ پنجہ اور پھول سی وہ نرم کلائی
وہ اُنگلیاں جن میں ہنر عقدہ کشائی
زور ایسا جہاں کو وہ سبک ہاتھ کے تل سے
دو شیروں سے بچکر ستم ایجاد کدھر جائے
خالی بھی جو دے وار تو پھر خون میں بھر جائے
بزدل جو ہے کیونکر وہ دلیروں سے بچے گا
کس میں تھی ضیا پنجوں کی ضو کے برابر
بجلی نہ چمک سکتی تھی پرتو کے برابر
بچتا تھا نہ وہ نوک بھی جا لگتی تھی جس کو
کاٹی جو سپر فرقِ جفا جو پہ نہ ٹھہری
چار آئینۂ ظالمِ بدخو پہ نہ ٹھہری
کیا روز تھا کیا ضربتِ شمشیر نکو تھی
بھالوں میں جو تیغوں کو سنبھالے نظر آئے
ریتی پہ طپاں برچھیوں والے نظر آئے
غل تھا کہ رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

اس نخل کو تلوار سے کاٹا اُسے چھانٹا
نکلی نہ کوئی شاخ نہ اُلجھا کوئی کانٹا
غل تھا کہ بہار ایسی خزاں میں نہیں دیکھی
ضربِ اسداللہ کا سب ڈھنگ دکھایا
راکب کو بھی مرکب کو بھی چو رنگ دکھایا
ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی طیار نہ ہوگا
سب جس سے ہویدا ید بیضا کی صفائی
ضیغم کے بھی پنجے نے یہ قوت نہیں پائی
ضرب ایسی کہ پوچھے کوئی جبریل کے دل سے
گر منہ پہ چڑھے یہ تو سر نحس اُتر جائے
بس زیست اسی میں ہے کہ تلوار سے مر جائے
بھاگے گا تو کیا صید یہ شیروں سے بچے گا
گویا کہ مہِ نو تھا مہِ نو کے برابر
سر خاک پہ گر پڑتے تھے ستو کے برابر
رہ جاتا تھا وہ جل کے ہوا لگتی تھی جس کو
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری
گھوڑے کی بھی گردن ہی اُکٹ آئیں دو ٹکھی
افسر نظر آئے نہ رسالے نظر آئے
ہر صف کی جگہ خون کے تھالے نظر آئے
بچوں کو اس انداز سے لڑتے نہیں دیکھا

چار آئے جو لڑنے کو تو اک دل ہوئے دونوں
گرما کے فرس جنگ پہ مائل ہوئے دونوں
ششدر نہیں ہوتے جو شجاعت کے دھنی ہیں
یہ سنتے ہی بچّوں پہ جھپٹ کر وہیں آئے
لشکر نے یہ جانا کہ وہ بجلی نکل آئے
احسنت کا برپا ہوا غل چرخ بریں پر
کیا ذکر بھلا آٹھ کا یا چار سروں کا
گننا ہوا اب تو ہمیں دشوار سروں کا
تھم سکتے نہ تھے پاؤں کسی عربدہ جو کے
اعدا تھے دمِ جائزہ ہر بار نددارد
پیدل نظری فوج کے اسوار ندارد
یوں فوج کے دفتر کو اُلٹتے نہیں دیکھا
یہ تھک کے جو ٹھہرا تو وہ لشکر میں در آیا
یہ ڈوب گیا جب تو وہ اُدھر سے اِدھر آئے
ہٹ جائے گا لشکر تو یہ خود چڑھ کے لڑیں گے
جانباز یاں دکھلاتے تھے میداں میں وہ جانباز
قاسم کا سخن تھا کہ علی کا ہے سب انداز
بڑھتے تھے کبھی گاہ سرک جاتے تھے عباس
ہر بار صدا دیتے تھے اے گیسوؤں والو
رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو
اب ہٹنے کی مہلت مری جاں ان کو نہ دینا

ٹھہرے نہ ہٹے نہ متامل ہوئے دونوں
چاروں سے یہ فرما کے مقابل ہوئے دونوں
تم چار ہو ہم دو ہیں مگر پنجتنی ہیں
غصّے سے دلیروں کے بھی ابرو پہ بل آئے
آنا تھا کہ چاروں تہِ تیغِ اجل آئے
ٹکڑے جو گنے چار کے تھے آٹھ زمیں پر
کشتوں کے جو پشتے تھے تو انبار سروں کا
اِک مینہ سا برس جاتا تھا ہر بار سروں کا
کٹتی تھی زمیں رن کی ڈریروں سے لہو کے
منشی کے قلم ہاتھ علمدار ندارد
دو آئے تو دو چار تھے پھر چار ندارد
یوں چہرے پہ چہرہ کبھی کٹتے نہیں دیکھا
رستے کو تڑپتے ہوئے لاشوں سے بھر آیا
اک چاند تہِ خاک چھپا اک نظر آیا
چھوٹے ہیں مگر بھائی سے کچھ بڑھ کے لڑیں گے
دل تھامے ہوئے دیکھتے تھے شاہ سرافراز
فرماتے تھے اکبر یہ لڑائی ہے کہ اعجاز
جب وار وہ کرتے تھے پھڑک جاتے تھے عباس
کیا کہنا ہے پھر بڑھ کے یہی ہاتھ نکالو
حلقہ ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو
منّت بھی کریں گر تو اماں ان کو نہ دینا

ہاں شیروں کے شیروں کا یہی کام ہے شیرو
پنجے ہیں تمھارے سپہِ شام ہے شیرو
اک شمس تو اک برجِ شرافت کا قمر ہے
شہ کہتے تھے بچّے ہیں لڑیں ہائے کہاں تک
دو روز سے پانی نہیں پہونچا ہے وہاں تک
سیراب بھی یہ تشنہ وہاں ہونے نہ پائے

سیدانیاں دروازوں پہ تھیں کھولے ہوئے سر
فضّہ تھی پریشاں کیے مو خیمے کے باہر
بتلا نے مجھے بچّے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
دو رخ پہ نظر آتے ہیں اڑتے ہوئے گیسو
ڈھالیں لیئے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو
بہتا ہے لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں

زینب نے کہا دونوں ہیں یکجا کہ جدا ہیں
لاکھوں ہیں عدو اور وہ دو ماہ لقا ہیں
دم خوف سے سینے میں سماتا نہیں اب تو
یہ سنتے ہی ڈیوڑھی سے ہٹیں حضرتِ زینب
اب کچھ نہیں وسواس بر آیا مرا مطلب
بچے مرے داخل ہوئے خیلِ شہدا میں

یہ ذکر تھا جو طبل بجا فتح کا ناگاہ
سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینبِ ذی جاہ
تلواریں علم قاسم و عباس لیئے تھے

بس آج لڑائی میں بڑا نام ہے شیرو
تم دونوں کا جد صاحبِ صمصام ہے شیرو
ماں کس کی ہے بیٹی تو پدر کس کا پسر ہے
لاکھوں سے لڑے دونوں میں طاقت تھی جہاں تک
اب پھیر کے کوئی انھیں لے آئے یہاں تک
ہے ہے مرے گھر میں یہ جواں ہونے نہ پائے

اصغر کو لیئے کانپتی تھی بانوئے بے پر
پردے سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی خواہر
دکھتی تھی لاکھوں سے دغا کرتے ہیں دونوں
وہ بچے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

کی عرض یہ روکر کہ نہیں ایک ہی جا ہیں
منہ پھیر سے چھپیے ہوئے سرگرمِ دغا ہیں
ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں اب تو
فرمایا کہ بچوں کا مرے خاتمہ ہے اب
لو بی بی ہو مل کر صفِ ماتم پہ چلو اب
سجدہ تو کروں شکر کا درگاہِ خدا میں

چلائے حرم لٹ گئی بنتِ اسد اللہ
دوڑے طرفِ لاشِ غازی روتے ہوئے شاہ
ہمشکلِ نبیؐ چاک گریباں کیئے تھے

عباسؑ نے غصّے میں لعینوں کو ہٹایا
پسپا ہوئے کفّار کوئی تاب نہ لایا
آلودۂ خوں دو مہِ کامل نظر آئے
سرتا بہ قدم چور تھے زخموں سے تنِ زار
پیکانِ سہ پہلو تھے کئی چھاتیوں کے پار
لب پر یہ سخن تھا شہِ والا نہیں آئے

لاشوں کے قریب آ کے پکارے شہِ صفدر
بے گرم زمیں اور یہ گل سے تنِ انور
ماموں سے عجب وقت میں منہ موڑ رہے ہو
اے عونؑ و محمدؑ یہ جفا تم نے اُٹھائی
راحت مرے گھر میں ذرا تم نے اُٹھائی
مانع جو ہوئی ماں سو گئے یم پھر نہیں دیکھا

اے شبّر جوانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
اے مرتبہ دانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ساتھ اپنے جہاں سے مجھے لیتے نہ گئے تم
اکبر نے کہا عون کے بازو کو ہلا کر
ماموں کو پکارے بھی نہ تم برچھیاں کھا کر
لوگھر میں جلی بی بیاں سب غش میں پڑی ہیں

خم ہو کے یہ چھوٹے کو علمدار پکارے
کیا منہ میں زباں اینٹھ گئی پیاس کے مارے
ہاتھوں کو ذرا جوڑ کے کچھ بات تو کر لو
بجلی سے بھی کچھ بڑھ کے گرا تیغ کا سایا
شبیرؑ نے لاشوں کو تڑپتا ہوا پایا
گودی کے پلے خاک پہ بسمل نظر آئے

انگڑائیاں لینے سے رگیں کھنچتی تھیں ہر بار
تلواریں تھیں قبضوں میں مگر ہاتھ تھے بیکار
دم ہونٹوں پہ آئے مگر آقا نہیں آئے
اے بھانجو موجود ہے بیکس و بے پر
رہتی سے اُٹھا کر مرے زانو پہ رکھو سر
کن آنکھوں سے دیکھوں کہ دم توڑ رہے ہو

ایذائے عطش سب سے سوا تم نے اُٹھائی
کیا کیا نہ صعوبت بخدا تم نے اُٹھائی
اس عمر میں تم سا کوئی صابر نہیں دیکھا
اے تیز زبانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
اے تشنہ دہانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
کاندھا مرے تابوت کو دیتے نہ گئے تم

بھیا تمھیں چلاتے ہیں شہ اشک بہا کر
باتیں شہِ والا سے کرو ہوش میں آ کر
سر ننگے پھوپھی خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑی ہیں
اے تشنہ دہن اے مرے جانی مرے پیارے
چونکو کہ عجب حال ہے ماموں کا تمھارے
بیٹا شہِ والا سے ملاقات تو کر لو

سُن کر یہ صدا ہوش میں آئے وہ دلاور
اٹکے تھے جو اُکھڑے ہوئے دم سینوں کے اندر
فردوس معلّٰی کے مسافر ہوئے دونوں
گودی میں تھے وہ جنھیں آغوش میں پالا

بسمل کی طرح گر کے جو تڑپے شہِ والا
رقّت کا تھا یہ جوش کہ تھرّاتے تھے شبیر
عباسؑ نے کی عرض بہ بادیدۂ خونبار
لے چلیے اُنھیں خیمے میں اب یا شہِ ابرار
لاشے جو نہ جائیں گے تو غم کھائیں گی زینب

یہ سنتے ہی لاشے شہِ والا نے اُٹھائے
غل تھا کوئی جلدی صفِ ماتم کو بچھائے
چھوٹے کو علی اکبرِ دلگیر لیے ہیں
زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے
لوگو مرے پیارے نے بڑے بچ اُٹھائے

دو روز سے وہ سرورِ والا تشنہ دہاں ہے
اِن دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی
میں ماں ہوں نہ صاحب مجھے یہ بات نہ بھائی
دِل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
بانو نے کہا کونسی وسواس کی ہے جا
شق ہوتا ہے مظلوموں کی غربت پہ کلیجا
گھر تک کوئی واماندوں کو پہونچا نہیں دیتا

سر رکھ دیئے گھبرا کے شہِ دیں کے قدم پہ
دو ہچکیاں لیں دونوں صغیروں نے برابر
کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ آخر ہوئے دونوں
آنکھیں تھیں لہو اور جگر تھا تہ و بالا
عباسؑ نے تھاما علیؑ اکبر نے سنبھالا

ہر مرتبہ لاشوں سے لپٹ جاتے تھے شبیر
خیمے سے نکل آئیں نہ سیدانیاں یک بار
بہتر ہے کہ ماں دیکھ لے فرزندوں کا دیدار
یہ قبر میں سوئے تو کہاں پائیں گی زینب

خیمے کے قریں دونوں کو روتے ہوئے لائے
لو آئے شہنشاہ کی ہمشیر کے جائے
اک لاش کو خود گود میں شبیر لیئے ہیں
ہے ہے علی اکبر اُسے کیوں گود میں لائے
صدقے یہ پھوپھی لاش کے لے آنے کے جائے

اس بوجھ کی طاقت مرے بچّے میں کہاں ہے
بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی
اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی
صدقہ اب اُتاروں گی تو وسواس مٹے گا
ہمشکلِ نبی لاشوں کو لائے تو ہوا کیا
ہے ہے وہ کوئی غیر تھے اے دخترِ زہرا
بھائی کوئی کیا بھائی کو کاندھا نہیں دیتا

ان دونوں کے عاشق تھے علی اکبرِ گلرو
ایسا یہ نہیں غم کہ تھمیں آنکھ سے آنسو
کل تک تھے بہم آج اکیلے ہوے دونوں
دونوں تھے اسی بھائی کے آرام کے طالب
وسواس کا یہ کونسا ہنگام ہے صاحب
ساتھ اب نہ کوئی جوڑے ہوئے ہاتھ رہے گا
ناگاہ شہِ عرش نشیں لاشوں کو لائے
تھم کر صفِ ماتم کے قریں لاشوں کو لائے
دونوں کا لٹانا تھا کہ غش کر گئی زینبؓ
ہوش آیا تو اکبر سے کہا رانڈوں کو سمجھاؤ
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ ادھر آؤ
بانو ہیں کدھر آہ یہ کیا بے خبری ہے
حضرت سے کہا آپ کو ایذا ہوئی یا شاہ
حضرت نے کہا مدح میں قاصر ہے زباں آہ
نانا کی طرح دونوں نواسوں نے وغا کی
تیغوں میں یہ تیزی یہ صفائی نہیں دیکھی
شیروں کی یہ پُر زور کلائی نہیں دیکھی
صفّین و جمل میں بھی رن ایسے نہ پڑے تھے
عباس نے کی عرض زباں لاؤں کہاں سے
لڑتے تھے اسی طرح علی فوجِ گراں سے
تلواریں جب اُن کی مجھے یاد آتی ہیں بھینا

چھوڑا نہ اُنھوں نے بھی کبھی بھائی کا پہلو
بس تلخ ہوئی زندگیِ اکبرِ خوشخو
بھائی بھی وہ جو ساتھ کے کھیلے ہوے دونوں
جانے وہی جس شخص پہ گزریں یہ مصائب
بیجاں ہوے ہیں علی اکبر کے مصاحب
شہزادہ کو نین اُسے کون کہے گا
غل پڑ گیا لو سرورِ دیں لاشوں کو لائے
ہمشیر تھیں جس صف میں وہیں لاشوں کو لائے
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئی زینبؓ
ہے ہے نہ کرو صاحبو اک لحظہ ٹھہر جاؤ
کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے
کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ
زینب مجھے یاد آگئی جنگ اسد اللہ
بچوں کی نہ تھی جنگ یہ قدرت تھی خدا کی
یہ ضرب یہ پھرتی یہ لڑائی نہیں دیکھی
اعدا میں یہ ہل چل یہ دُہائی نہیں دیکھی
تم پوچھ لو عباس تو نزدیک کھڑے تھے
جو کر گئے یہ لال وہ باہر ہے بیاں سے
افسوس کہ یوں اُٹھ گئے یہ شیر جہاں سے
دو بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں بھینا

کیا عرض کروں ہائے محمدؐ کی لڑائی
بس صاف تھی صفیں کی سرحد کی لڑائی
رن پر جو چڑھا ہو وہی جانے کہ یہ کیا تھا
یہ سنتے ہی سُرخی سی رُخ زرد پہ آئی
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی
آقا مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ ان کے
فرما کے یہ لیں اُن کی بلائیں کئی باری
کرتے ہیں امامِ دو جہاں مدح تمھاری
صدقے گئی یہ نیند ہے یا غش میں پڑے ہو
کچھ آج ہے غفلت عجب ای نیند کے ماتو
چونکو مری خاطر سے اب ای نیند کے ماتو
پھر کیا ہے جو بچپن کے یہ انداز نہیں ہیں
اب ضبط کی طاقت نہیں اماں کو سنبھالو
سینے میں اُلجھتا ہے دم ای گیسوؤں والو
میں ہونگی تو راحت سے تمھیں پاس نہ ہوگی
پہلا تو سفر اور نئے لوگ نئی راہ
صدقے گئی رستے سے بھی تم تو نہیں آگاہ
پُرہول ہے رستہ مجھے تشویش بڑی ہے
ٹوکے کوئی رستے میں تو ڈر یو نہ مری جان
اقرارِ نبوت میں فصاحت کا رہے دھیان
کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے

گویا کہ یہ دیکھے ہوئے تھا جد کی لڑائی
غل تھا کہ یہ ہے بازوے احمد کی لڑائی
دنیا میں علی آج جو ہوتے تو مزا تھا
حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
اب شاد ہوئی ان سے یداللہ کی جائی
بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ ان کے
شانوں کو ہلا کرکے یہ آہستہ پکاری
یہ کیا ہے جو تسلیم کو اُٹھتے نہیں واری
بیٹھے ہیں حسین ابن علی اُٹھ تو کھڑے ہو
باعث ہے یہ بچپن کا سبب ای نیند کے ماتو
پھر سو ہو آتی ہے شب ای نیند کے ماتو
گردن ہے کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں
انگڑائیاں لو بات کرو نیند کو ٹالو
واری مجھے خدمت کے لیے پاس بلا لو
کیا گزرے گی منزل پہ جو ماں پاس نہ ہوگی
کس طور سے گزریں گی یہ تاریک شبیں آہ
پہونچائے تمھیں خیر سے فردوس میں اللہ
قربان ہو ماں قبر کی منزل بھی کڑی ہے
ہاں کلمۂ توحید پڑھے جائیو ہر آن
دلبند ہو تم تین اماموں کے میں قربان
ہم آتے ہیں لشکر سے حسین ابنِ علی کے

ای عون خبردار مرے چھوٹے پسر سے
شب کو یہ اکیلا کبھی نکلا نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف ہی نہ غربت کے سفر سے
محروم رہونگی میں سدا خیر و خبر سے
واماندوں پہ ظاہر ہو یہ وہ بھید نہیں ہی
ای وائے خط آنے کی بھی اُمید نہیں ہی

بچوں کے یہ سن ہائے غضب اور سفر ایسا
لائے گا خبر کون کہاں نامہ بر ایسا
برباد نہ ہو یوں کوئی آباد گھر ایسا
نظروں سے نہ پوشیدہ ہو شمس و قمر ایسا
کس ناز و نعم سے یہ خوش اقبال پلے تھے
قبروں کے لیے ہائے مرے لال پلے تھے

اب کون مرے پہلوؤں میں سوئے گا بچو
تڑپے گا کلیجا مرا دل روئے گا بچو
یہ داغ تو دنیا سے مجھے کھوئے گا بچو
دن جا کے شب آئے گی تو کیا ہوئے گا بچو
راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی
مرجاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی

دُنیا کو نہ دیکھا تھا کہ موت آ گئی تم کو
خیمے سے نکلتے ہی اجل پا گئی تم کو
ماں صدقے ہو جنگل کی ہوا بھا گئی تم کو
ای گل بدنو کس کی نظر کھا گئی تم کو
ہی ہی مجھے پوشاک شہانی نہ دکھائی
صدقے گئی اماں کو جوانی نہ دکھائی

مرتے ہوئے پانی بھی نہ مانگا مرے ڈر سے
پیاسے سوئے فردوس سدھارے مرے گھر سے
بے آب تھے اس عمر میں چوبیس پہر سے
دیکھا بھی نہ دریا کو توجہ کی نظر سے
سہواً جو پڑی آنکھ تو منہ موڑ لیا ہی
ڈرتے تھے کہ اماں نے ہمیں منع کیا ہی

غصے ہوئی تھی تم پہ میں واری مجھے بخشو
ماں اب نہیں لونڈی ہوں تمھاری مجھے بخشو
لب پر سخن عذر ہیں جاری مجھے بخشو
صدمے سے غشی ہوتی ہی طاری مجھے بخشو
میں بھی تو یہ جانوں کہ دل افسردہ نہیں ہی
لو کہدو بس اتنا کہ ہم آزردہ نہیں ہیں

یہ کہہ کے جو چھاتی پہ دوہتڑ کئی مارے
سینہ ہوا شق ہاتھ بھی نیلے ہوئے سارے
ہمشکل نبی پاؤں پہ گر کر یہ پکارے
بس والدہ اب روئیو لاشے پہ ہمارے
اب پیاس میں آب دم شمشیر پئیں گے
بھائی نہ رہے خلق میں ہم بھی نہ جئیں گے

گھبرا کے وہ مخدومۂ عالم یہ پکاری
بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آؤں نہ واری
باتوں میں بھی کچھ بہن کے پہلو نہیں نکلے
فرما کے یہ غش ہو گئیں اور پھر ہوئیں ہشیار
بانو نے کہا شاہ سے با دیدۂ خونبار
ابھی جو غش آیا تو گزر جائیں گی زینب
یہ ماتم اولاد ہی کیونکر اسے ٹالیں
اکبر کی سُنیں یا جگر و دل کو سنبھالیں
بالائے جگر خنجر بیداد پھرے ہیں
یہ سُنتے ہی لاشوں کو اُٹھانے لگے سرور
بانو نے کھڑے ہو کے ادھر روک لی چادر
ٹھہرو ابھی کیوں داغ دیئے جاتے ہو لوگو
دیکھا نہیں جی بھر کے ابھی بیٹوں کا دیدار
چھوٹے کو بھی چھاتی سے لگا لے یہ دل افگار
گھر میں مرے کاہے کو یہ پھر آئیں گے جا کے
در تک گئیں لاشوں سے لپٹنے کو کھلے سر
چلّائیں درِ خیمہ کے پردے کو اُٹھا کر
ڈر ہے کہ خفا مجھ سے مرے لال نہ ہو جائیں
یہ وقت نہیں طول کا خاموش انیسؔ اب
ہر دم ہے عنایاتِ محمدؐ کرمِ رب
حسنِ فصحا جسنا ہے یہ شیریں سخنی ہے

مر جائے یہ ناشاد بلا لیکے تمھاری
تم روو گے اس ڈر سے میں کرتی نہیں زاری
آنکھوں سے مری دیکھ لو آنسو نہیں نکلے
پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرادلدار
اب فرق بصارت میں بھی ہے یا شہِ ابرار
لے جایئے لاشے نہیں مر جائیں گی زینب
مر جائیں جنھیں دل کی طرح گود میں پالیں
در آئی ہیں اک قلب میں دو تیروں کی پھالیں
دو غم کے پہاڑ ایک ضعیفہ پہ گرے ہیں
رانڈیں صفِ ماتم سے اُٹھیں کھولے ہوئے سر
چلّائی سمجھ کر یہ شہِ مظلوم کی خواہر
ہے ہے مرے بچّوں کو لیے جاتے ہو لوگو
دونوں کی بلائیں مجھے لینے دو اکبار
مادر سے مکدّر نہ ہوں یہ آئینہ رخسار
دینے دو کفن دونوں کو زہرا کی ردا کے
پر رانڈوں نے جانے نہ دیا خیمے کے باہر
گاڑو گے کہاں بھائیوں کو اے علی اکبر
صدقے گئی لاشے کہیں پامال نہ ہو جائیں
جتنے ہیں سخن فہم وہ عاشق ہیں ترے سب
اب جلد وہ حاصل ہو جو کچھ ہے ترا مطلب
پیری میں جواں ہے تو فقیری میں غنی ہے

مرثیہ (۷)

دوزخ سے جو آزاد کیا حُر کو خدا نے
زانو پہ رکھا سر کو امامِ دوسرا نے
سب جس کے طلبگار تھے جنت میں وہ دُر تھا
چرچا تھا کہ مہمانِ حسین آتا ہے دیکھو
مولائے شہِ بدر و حنین آتا ہے دیکھو
دم نکلا ہے گودی میں شہنشاہِ زمن کی
اللہ کے لشکر کا ہراول ہے یہ غازی
خاکِ قدمِ احمدِ مرسل ہے یہ غازی
اس پر نظرِ لطفِ شہنشاہِ نجف ہے
اللہ کی درگاہ کا مقبول ہے یہ بھی
مجرم پہ کرم شاہ کا معمول ہے یہ بھی
نیکوں سے بدی وہ نہیں کرتا جو بھلا ہے
کیا اصل تھی اس نخل کی اور کیا ثمر آیا
لو شام کا بھولا ہوا وقتِ سحر آیا
نیزوں کو عصا تیغوں کو پُل کر دیا اس نے
کِس لشکرِ بد خو سے بگڑ کر نکل آیا
تنتا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا
کعبہ کی طرف دیر میں گر دیر سے پہونچا

کھلوا دیئے فردوس کے در عقدہ کشا نے
اعلیٰ کیا ادنیٰ کو بزرگوں کی دعا نے
حورانِ جناں گرد تھیں اور بیچ میں حُر تھا
دنیا سے بصد زینت و زیب آتا ہے دیکھو
شیدائے رسول الثقلین آتا ہے دیکھو
سونگھو اسے خوشبو ہے یہ زہرا کے چمن کی
بعد اس کے ہیں سب کشتۂ اوّل ہے یہ غازی
رُتبے میں ملائک سے بھی افضل ہے یہ غازی
آنکھیں ہم اگر فرش کریں عین شرف ہے
مقبول نہ کیونکر ہو کہ مقتول ہے یہ بھی
گلدستۂ اسلام کا اک پھول ہے یہ بھی
مرجھا گئے یہ پھولا ہے خزاں ہو گئے پھلا ہے
اللہ کی قدرت یہ کہاں تھا کدھر آیا
تلواروں کی دریا سے سلامت اُتر آیا
آتش کو چمن خار کو گل کر دیا اُس نے
دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا
نیزہ تھا کہ ہر قلب میں گڑ کر نکل آیا
شر نے اُسے روکا تھا مگر خیر سے پہونچا

حوروں کے وہ چہرے وہ ضیائے دُرِ دنداں
باتوں کی ملاحت لبِ شیریں سے دو چنداں
سودا ہو پری دیکھ لے گر حور کی آنکھیں
ہاتوں پہ وہ کوثر کے چھلکتے ہوئے ساغر
شیشے وہ بلوریں وہ چمکتے ہوئے ساغر
پژمردہ اگر غنچۂ خاطر ہو تو کھل جائے

وہ نرگسی آنکھیں وہ اُن آنکھوں کے اشارے
دیکھ اس طرف اے حضرتِ شبیر کے پیارے
سیراب ہو گر مَے سے اگر تشنہ دہن ہے
حوریں کریں شوقیہ سخن واہ ری قسمت
سر گود میں لیں شاہِ زمن واہ ری قسمت
مرنا وہ کہ عالم کے خبر گیر سرہانے

اللہ ری وفائے رفقائے شہِ ذی جاہ
سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہِ ذی جاہ
دنیا کی نہ جانب ہے نہ دریا کی طرف ہے
مرنے پہ کسے تھا کمر ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے
دشوار انھیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی

ایماں شہِ والا کی وِلا جانتے تھے وہ
جینے کو ہوس دم کو ہوا جانتے تھے وہ
کچھ فرق اطاعت میں ذرہ ناکام نہ لائے

کوئی متبسّم کوئی حیراں کوئی خنداں
سُن پائیں تو چاٹا کریں ہونٹوں کو سخنداں
سورج کی چمک چاند کا منہ نور کی آنکھیں
پانی وہ سباب اور وہ چھلکتے ہوئے ساغر
وہ مشک کی خوشبو وہ مہکتے ہوئے ساغر
برسوں نہ لگے پیاس گر اک جام بھی مل جائے

اُٹھ سایۂ طوبیٰ سے چل اب گھر میں ہمارے
ساماں ہیں مہیّا ترے آرام کے سارے
وہ کوثر و تسنیم ہے یہ نہرِ لبن ہے
مشتاق ہو جنّت کا چمن واہ ری قسمت
بھائی کہیں حضرت کی بہن واہ ری قسمت
پہلو میں علی حضرتِ شبیر سرہانے

دل سینوں میں لبریزِ ولائے شہِ ذی جاہ
کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہِ ذی جاہ
مرتے ہوئے آنکھیں شہِ والا کی طرف ہیں
کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے
کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے
کوثر سے نظر خلد سے جان اُن کی لڑی تھی

مر جانے کو تو عینِ وفا جانتے تھے وہ
فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ
پانی کا زبانوں پہ کبھی نام نہ لائے

وہ ابن مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد
اعدا کے لیے تیغ ہلالی دم ناورد
سب چھوٹے مگر دامن حضرت نہیں چھوڑا
جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسم بے پر
ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجکو
سب جاتے ہیں اور رن کی وہ رخصت نہیں لیتے
سیّد سے سرافرازی کا خلعت نہیں لیتے
پانی نہ ملے گر دم آخر نہ ملے گا
کم عمر ہیں عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
ہے ہے انھیں شبیر سے پیاری ہو ئیں جانیں
اب نیر جگر گوشۂ زہرا پہ چلیں گے
وہ نام پہ مرتے ہیں جو ہیں عاقل ذی ہوش
موقع ہو تو گویا کہیں رہتے بھی ہیں خاموش
فرق اُن کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
یہ ذکر تھا نوشاہ جو روتے ہوئے آئے
اب جاتے ہیں لڑنے کو پھوپی جان کہے جائے
اب بھی ہمیں پیغام اجل آ نہیں جاتا
زینب نے کہا میری مراد آئی سدھاریں
دشمن جو ہوں فرزند علی کے انھیں ماریں
یہ کس کا لہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے

دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جواں مرد
مرنے پہ بھی لب تک نے رہ دولت نہیں چھوڑا
بے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجکو
مرجانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے
سر دے کے جو ملتی ہے وہ دولت نہیں لیتے
کہدے کوئی ایسا انھیں دن پھر نہ ملے گا
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زباں میں
پچھتائینگے روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں
جب وقت نکل جائے گا پھر ہاتھ ملیں گے
سب دل میں کہیں گے کہ ہوئے جنگ سے روپوش
کیا جان کا پھر دھیان شجاعت کا ہو جب جوش
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے
مادر نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے
اُن بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے
یوں روتے ہیں شبیر کہ دیکھا نہیں جاتا
تیغوں میں گوارا ہوں مرے دودھ کی دھاریں
لڑنے پہ چڑھیں شمر کا سر تن سے اُتاریں
جب مر چکے دو بھائی تو وہ ہوش میں آئے

خیمہ میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
ساتھ اپنے اُنھیں لیکے گئی بانوے مضطر
یہ نورِ نظر لایقِ الطاف و عطا ہیں
مُنہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر
شکوہ ہی مقدّر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو

حُر کون تھا اور کون تھا بن قین بجلی
کیونکر ہو بھلا مادرِ مضطر کو تسلّی
آفت ہی یگانے ہی جو ہمّت نہ کریں گے
فرزندِ حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں
ہمشکلِ نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ جوشِ شجاعت انھیں کیوں ہی

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر
جب کوئی نہ ہووے گا تو یہ جنگ کریں گے
تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لیں تو سدھاریں

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہی
دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہی مادر
کی عرض کہ چھاتی سے لگالو انھیں خواہر
تقصیر ہوئی کیا جو حضور ان سے خفا ہیں

غیرت کی ہی جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو
ہی عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلّی
مقتل میں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلّی
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

عباسِ علی خوں میں نہالیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہی
خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
جرات میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
کیا عیب ہی پہلے نہ مرے بعد مریں گے

سر دینے میں سبقت نہیں کرتے ہیں وفادار
سردار سے پہلے نہیں مرتے ہیں وفادار
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے تو سدھاریں
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
سچ ہی کہ وفاداروں سے خالی ہی زمانہ
غیروں میں اب الفت ہی یگانوں میں نہیں ہی

کم عمر ہیں بچے ہیں یہ کیا وقت کو جانیں
واں تیغوں میں تابش ہے کڑکتی ہیں کمانیں
مذکورِ بزرگانِ خوش اوقات تو رہ جائے
ماں کو تو سبک کرچکے کنبے کی نظر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے
توڑ آئے ہوں خیبر کے کسی در کو تو کہہ دیں
تا کوفہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہہ دیں
کچھ چھپتی ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں
یہ ذکر تھا جو خیمہ میں داخل ہوئے شبیر
فرمایا شکایت کے سخن کیجیو نہ ہمشیر
تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے
افلاکِ شجاعت کے یہی دو ہیں شہنشاہ
پوچھے کوئی مجھ سے انھیں قدر ان کی نہیں آہ
ہلتی تھی زمیں غیظ سے خالق کے ولی کے
مالک ہو تم ان دونوں سے بگڑو کہ خفا ہو
ایسے ہیں کہ حق دودھ کا ان سے نہ ادا ہو
سمجھا کہ میں ہاتوں سے انھیں کھوؤں گی زینب
کس طرح میں اس دولتِ بیدار کو کھوتا
موت آتی تو سر دے کے میں اس دشت میں سوتا
کچھ بس نہیں چلتا جو اجل آتی ہے زینبؑ

رُخ زرد ہیں لب خشک ہیں سوکھی ہیں زبانیں
جو نام پہ مرتے ہیں وہ دیتے ہیں جانیں
جانیں نہ رہیں گر تو رہیں بات تو رہ جائے
ہیں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
کھولیں اسے باندھیں ہیں جو ہتیار کمر میں
لو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علی کے
مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں
خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہہ دیں
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں
دیکھا کہ ہیں بیٹوں سے خفا زینبِ دلگیر
ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحبِ توقیر
یہ شیر دلاور مرے روکے سے رکے تھے
رکھتے انھیں پردے میں جو ہوتے اسد اللہ
تم تو شہِ مرداں کی جلالت سے ہو آگاہ
یہ اور کی چتون نہیں تیور ہیں علی کے
بہتر ہے وہ غصہ جو مناسب ہو بجا ہو
میں کیا کروں گر دونوں کا مرنا تمھیں چاہو
جب یہ نہ ملیں گے تو بہت روؤ گی زینب
جیتا ہیں جو ان میں سے کوئی پاس نہ ہوتا
روتے یہ مری لاش پہ میں ان کو نہ روتا
موت ان کو مرے گھر سے لئے جاتی ہے زینبؑ

دو داغِ جگر سوز ہیں ہمشیر کروں کیا
کرتی ہی اکیلا مجھے تقدیر کروں کیا
صدمہ اُسے ہوتا ہی زیادہ جسے روکوں
زینب نے کہا آپ الم ان کا نہ کیجے
قربان ہیں سب بھانجے ہوں یا کہ بھتیجے
بیٹے بھی فدا آپ پہ ہیں میں بھی فدا ہوں
تھرّا کے وہ بولی کہ ہماری نہیں تقصیر
فرمایا شجاعت کے منافی ہی یہ تقریر
جاتے ہوئے کس دوست کو آقا نے نہ روکا
جو مرد ہیں۔ پہلے وہی مرجاتے ہیں پیارو
صدقے گئی اُلجھی ہوئی زلفیں تو سنوارو
سر دے کے جسے پاتے ہیں وہ راہ یہی ہی
پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتیار
مجرے کو جھکے ماں کے جو وہ آئینہ رخسار
فرمایا ادا سر سے کرو حقِ شہِ دیں کا
فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا
مظلومیتِ حضرتِ شبیر دکھانا
تلوار اگر لاکھ چلیں سر نہ فرو ہو
حیدر کی شجاعت کا معرّف ہی زمانا
ہنس ہنس کے تم اُن چھاتیوں پر برچھیاں کھانا
ظلمت ہو قمر پر یہ سزاوار نہیں ہی

بچّوں کے بچا لینے کی تدبیر کروں کیا
رُکتے نہیں یہ صاحبِ شمشیر کروں کیا
مشکل ہی مجھے کس کو رضا دوں کسے روکوں
طالب ہیں تو بہتر ہی اجازت انھیں دیجے
گردھیان ہی میرا تو قسم رونے کی لیجے
دیر اتنی ہوئی کیوں ہیں اسی پر تو خفا ہوں
قسمت میں خجالت تھی نہ یاد رہوی تقدیر
مسلم کے پسر کاہے کو تھے صاحبِ شمشیر
روکا تھیں اُن کو شہِ والا نے نہ روکا
آزردہ تھی پر خیر خوشی اب ہوں سدھارو
واری یہ تمنّا ہی کہ سر ماموں پہ وارو
صدقے گئی شادی ہی یہی بیاہ یہی ہی
غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار
سینے میں تڑپنے لگا زینب کا دلِ زار
لو جاؤ مبارک ہو سفر خلدِ بریں کا
دادا کی طرح جوہرِ شمشیر دکھانا
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
جو سامنے آجائے وہ اک ضرب میں دو ہو
فوجوں پہ اسی دبدبہ و شان سے جانا
جرات کے منافی ہی سپر چہرے پہ لانا
جو منہ کو چھپاتا ہی وہ رودار نہیں ہی

بلوہ ہو تو پروا نہ رہے بھائی پہ بھائی
دکھلائیو ان چھوٹے سے ہاتوں کی صفائی
گر مر گئے توقیر بھی عزت بھی ملے گی

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا

کی عرض یہی ہووے گا ای مادرِ غمخوار
اس پیاس میں صابر ہیں غلامانِ وفادار
دیجے گا سزا فرق اطاعت ہیں گر آئے

یہ کہتے ہوئے خیمے سے صفدر نکل آئے
رومال رکھے آنکھوں پہ اکبر نکل آئے
قدموں پہ جھکے وہ جو شہنشاہِ زمن کے

شرما کے کہا جاؤ خدا حافظ و ناصر
اب دل کو نہ تڑپاؤ خدا حافظ و ناصر
ناشاد پُر ارمان مرے گھر سے چلے ہو

تھامے جو رہے بازوؤں کو قاسم و اکبر
الفت سے چلے ساتھ علمدارِ دلاور
کچھ فوجِ شقاوت نہیں دور آپ ٹھہر جائیں

فرمایا کہ دل سینے میں ٹھہرے تو میں ٹھہروں
دریا سے ہٹالوں جو یہ بپھرے تو میں ٹھہروں
لازم ہے کہ جاؤں تو صفیں توڑ کے جاؤں

مثلِ جسد و روح نہ دم بھر ہو جدائی
جانیں جو لڑاؤ گے تو سر ہوگی لڑائی
میں وہ بھی بخشوں گی شہادت بھی ملے گی

غش کھا کے جو گر یو بھی تو دریا کے کنارے
یہ آب رواں بند ہے ماموں پہ تمہارے
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

کیا بات ہے جیتے ہیں تو مرنا نہیں دشوار
دریا کو نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار
پھر دیکھیں نہ منہ آپ جو رخ تک سپر آئے

اِک برج سے دو چاند برابر نکل آئے
شبیر بھی روتے ہوئے باہر نکل آئے
کس جبر سے رخصت کیا بیٹوں کو بہن کے

شمشیر و سناں کھاؤ خدا حافظ و ناصر
چھاتی سے لگو آؤ خدا حافظ و ناصر
گھوڑوں پہ چڑھالوں میں کہ گودی میں پلے ہو

گھوڑوں پہ چڑھے زینبِ ناشاد کے دلبر
تب کہنے لگے جوڑ کے ہاتوں کو وہ صفدر
آقا یہ مصیبت ہے حضور آپ ٹھہر جائیں

دو زخم نہ ہوں دل پہ جو گھہرے تو میں ٹھہروں
باغی ہوں ستمگار دل کے ٹھہرے تو میں ٹھہروں
زینب سے کہوں کیا جو تمھیں چھوڑ کے جاؤں

چھکنے لگے گھوڑوں سے جو وہ آئنہ رُخسار
تیغوں میں چلے جنسِ شہادت کے طلبگار
ساتھ اُن کے ہرنِ جسبتِ مِیں گشت میں پہنچے
یوں آئے کہ جس طرح نسیمِ چمن آئے
سَونلائے ہوئے دھوپ میں گل پیرہن آئے
شیر آتے ہیں لشکر سے ولی ابنِ ولی کے
دو صاعقہ لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے
دو شیر صفِ جنگ کو تکتے ہوئے آئے
تھا شور کہ ہوش اُڑتے ہیں یاں کبکِ دری کے
وہ گردنیں گھوڑوں کی وہ سُم اور وہ سینے
چاروں وہ قدم اور وہ رکابوں کے قرینے
سرعت میں ہے راہ جبل و بحر صراط ایک
آہو ہیں کہ سرگرمِ تگ و دو ہیں زمیں پر
نعل ان کے نہیں آٹھ مہِ نو ہیں زمیں پر
طاؤس میں جلوہ ہے یہ یہ چال نہیں ہے
کیا دونوں کو اسپانِ سبکتاز ملے تھے
فتراک نہیں تھے پرِ پرواز ملے تھے
شیروں کا بھی یہ رعبِ دمِ جنگ نہیں ہے
غصّہ میں جو ہر بار بپھر جاتے ہیں چل کے
اس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے
ہر گام پہ اُڑ جانے کو تیار ہیں دونوں

مغموم پھرے حضرتِ عباسِ علمدار
باگیں جو اُٹھائیں تو ہوا ہو گئے رہوار
اُڑتے ہوئے طاؤسِ چمن دشت میں پہنچے
گھوڑے تھے کہ دو آہوئے چین و ختن آئے
فوجوں میں ہوا شور کہ وہ صف شکن آئے
حضرت نے صدا دی کہ نواسے ہیں علیؑ کے
شعلے تھی کہ آندھی میں لپکتے ہوئے آئے
دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیمِ سحری کے
غل تھا کہ یہ سینے کبھی دیکھے ہیں کسی نے
کرسی کے یہ پائے ہیں تو ہیں عرش کے زینے
بلقیس کا تخت ایک سلیماں کی بساط ایک
دو شیر مہیائے رواروی ہیں زمیں پر
کیلیں نہ کہو اخترِ پرضو ہیں زمیں پر
پریوں کے کھلے بال ہیں یہ یال نہیں ہے
جانبازوں کو رہوار بھی جانباز ملے تھے
زینت کے لیئے سازِ خدا ساز ملے تھے
رستم کا کمربند ہے یہ تنگ نہیں ہے
آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے اُبل کے
گر ہاتھ میں ہو جام لبالب تو نہ چھلکے
بچوں کی سواری سے خبردار ہیں دونوں

نتھنوں پہ جو ہیں عرشِ الٰہی کے ستارے
خوش فہم ہیں ایسے کہ سمجھتے ہیں اشارے
کم سن ہیں یہ مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں
ہر چند ہیں دونوں کے رکابوں سے جدا پاؤں
ہیں راہ روِ جادۂ تسلیم و رضا پاؤں
شوکت جو دکھاتے ہیں سمندوں کو بڑھا کر
وہ برق یہ صرصر وہ چھلاوا یہ پری ہے
سرعت جسے کہتے ہیں وہ رگ رگ میں بھری ہے
نعل اُن کے کہیں برق ہیں شمشیر کہیں ہیں
گھوڑے ہیں کہ طاؤس شہادت کے چمن کے
گردن کے مہ نو سے وہ ٹوٹے ہوئے منکے
دونوں کے پسینے میں بھی سب عطر کی بو ہے
وہ شان وہ اجلال وہ شیروں کی نگاہیں
دعوے کہ فنا کر دیں ابھی ہم جسے چاہیں
فوجوں کو بھگایا ہے تو ہم بڑھ کے تھمے ہیں
فوجوں کی صفائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
ہاں قلعہ کشائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
یہ منہ کبھی تیغوں سے پھرے ہیں نہ پھریں گے
تم سب میں شجاعت کا دھنی جو ہو وہ نکلے
آمادۂ شمشیر زنی جو ہو وہ نکلے
تنہا نہیں آسکتی تو فوجیں بہم آئیں

جب ایڑیاں جمتی ہیں تو بھرتے ہیں طرارے
ہیں شاہسوار آپ یداللہ کے پیارے
کس حسن سے رہواروں کے سر باندھے ہوئے ہیں
منہ ملتی تھنیں قدموں پہ کھنچی جو ہوا پاؤں
کیا ران ہے کیا باگ ہے کیا ہاتھ ہے کیا پاؤں
حضرت نے سکھایا ہے یہ کاندھوں پہ چڑھا کر
وہ آہوِ صحرا ہے تو یہ کبکِ دری ہے
ہر گام نئی چال نئی جلوہ گری ہے
آہو کہیں چلتے ہیں کہیں شیر کہیں ہیں
بادپا وہ جلد ہیں کہ خجل پھول سمن کے
گھونگٹ میں بھی پیدا ہیں سب انداز دلھن کے
رفتار میں گرمی یہ پریزادوں کی خو ہے
نعرے جو کیے بند ہوئیں امن کی راہیں
ہمت وہ کہ جو منہ سے کہیں اس کو نباہیں
سرکے نہیں جب کھیت میں یہ پاؤں جمے ہیں
لشکر میں دہائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
بچوں کی لڑائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
مرتے ہوئے دس بیس قدم بڑھ کے کریں گے
بدخواہ امامِ مدنی جو ہو وہ نکلے
سر دفتر لشکر شکنی جو ہو وہ نکلے
کیوں دیر ہے گر تم نہیں بڑھتے تو ہم آئیں

تم لاکھ ہو ہم دو ہیں پہ راضی ہیں رضا پر
کھل جائیں نشاں چوب لگے طبل وغا پر
دیر اب نہ کرو جان لڑائی میں لڑی ہے
یہ ذکر ابھی تھا کہ خدنگ آئے اُدھر سے
سرہنگ جفا جوئی جنگ آئے اُدھر سے
ڈھالیں تھیں بہم گرز بھی ہاتوں میں تلے تھے
کڑکیں وہ کمانیں کہ ہوا فوج کا کڑکا
گہہ بجھ گیا خورشید کا شعلہ کبھی بھڑکا
نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے وغا ہے
دانتوں میں شجاعانِ عرب ایڑھیاں دابے
وہ گردنیں وہ سر تھے کہ معکوس قرابے
خوں آلِ محمد کا بہایا تھا انھیں نے
قبضوں پہ اِدھر ہاتھ سلح شوروں نے ڈالے
یاں سمجھے شیروں نے نیاموں سے نکالے
اک برق گری لشکرِ بدخو کی صفوں پر
تر بھر ہوا لشکر وہ صف اُس جا تھی یہ اُس جا
ہل چل ہوئی دو شیر گئے فوج میں جس جا
سمجھے تھے کہ شبیرؑ کا سر ہاتھ لگے گا
اے سیفِ زباں تازہ لڑائی مجھے دکھلا
شمشیرِ طلاقت کی صفائی مجھے دکھلا
پشتی کو ہے موجود وہ صفدر جو علی ہے

لاکھوں ہوں تو کیا ہیں نظر اپنی ہے خدا پر
جلدی ہے کہ صدقے ہوں امامِ دوسرا پر
ہم پیاسے ہیں دو روز کے اور دھوپ کڑی ہے
شمعوں کی طرح اڑ کے پتنگ آئے اُدھر سے
یاں سے جو بڑھے لعل تو سنگ آئے اُدھر سے
نیزے بھی چمکتے تھے پھریرے بھی کھلے تھے
تیغوں کی سفیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا
ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑکا
گھوڑے بھی بھڑکتے ہیں کہ شیروں سے وغا ہے
وہ صورتیں خونخوار وہ گھوڑے وہ رکابے
وہ آگ کے پتلے تھے تو شبدیز شتابے
سادات کے خیموں کو جلایا تھا انھیں نے
تیر آئے کمانوں سے بڑھے ظلم کے بھالے
فوجوں پہ چلے شاہ کی آغوش کے پالے
دو شیروں نے حملہ کیا آہو کی صفوں پر
آفت تھی نہ کس صف میں قیامت تھی نہ کس جا
لشکر میں یہ تھا شور کہ دنیا ہی نجس جا
جانیں تو چلیں اب کسے زر ہاتھ لگے گا
اے تیغِ علی قلعہ کشائی مجھے دکھلا
اے ذہنِ رسا اپنی صفائی مجھے دکھلا
پھر کھینچ وہ تلوار جو سو بار چلی ہے

یا شیرِ خدا سیف دو دم دیجیے مجھ کو
سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیے مجھ کو
بیڑے سپہِ شام کے ہٹتے نظر آئیں
کوثر کا بھرا جام پلا دیجیے مولا
ہر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیے مولا
میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
گو پیر ہوں پہ زورِ جوانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
جوہر ہے وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
تصویرِ پریشانیِ کفار دکھا دوں
جعفر کو ابھی جنگ پہ تیار دکھا دوں
رُخ سب قدر اندازوں کے پھرتے نظر آئیں
لو نیچے شہزادوں کے چلتے ہیں خبردار
رنگ افعیِ خونخوار بدلتے ہیں خبردار
جل جاتا ہے وہ آنچ ذرا لگتی ہے جس کو
دو ناگ ہیں پُر زہر کہ لہراتے ہیں سر پر
نکلے جو زمیں سے تو جگہ پاتے ہیں سر پر
کچھ پڑھ کے بھی پھونکے گا جو ناری تو جلے گا
بے مثل و عدیل ایک تو یکتا ہے ماں ایک
اک آتشِ جاں سوز ہے اور آبِ رواں ایک
میان اس کا الگ ہے تو غلاف اس کا جدا ہے

یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیے مجھ کو
میداں جو نہ چھوڑے وہ قدم دیجیے مجھ کو
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں
بالائے ولا اور ولا دیجیے مولا
شمشیرِ فصاحت کو جلا دیجیے مولا
مدت سے تو ہوں چپ تو زباں صاف نہیں ہے
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغ صفہانی ہے ابھی تک
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے
غیظ و غضبِ حیدرِ کرار دکھا دوں
ہر بند پہ چلتی ہوئی تلوار دکھا دوں
سرداروں کے سر خاک پہ گرتے نظر آئیں
لو بانبیوں سے ناگ نکلتے ہیں خبردار
لو مارِ سیہ زہر اُگلتے ہیں خبردار
پڑ جاتے ہیں نیل اُن کی ہوا لگتی ہے جن کو
گہہ پاؤں پہ آتے ہیں کبھی جاتے ہیں سر پر
چاٹا ہے دہن گرم ہوا کھاتے ہیں سر پر
اعجاز ہے ان پر کوئی افسوں نہ چلے گا
اُن باغوں پہ بادِ سموم ایک خزاں ایک
گھاٹ ایک روش ایک چمک ایک زباں ایک
اک جان ہے دو قالب اُسے کہیے تو بجا ہے

نصرت کا وہ یہ فتح کے گنجینے کا مشتاق
وہ سر کا یہ چار آئنہ میں سینے کا مشتاق
وہ تیر کے دل سے نکل آیا یہ جگر سے
وہ نیمچے خالی نہ کبھی جا کے پھر آئے
گہہ سن سے گئے اور کبھی لہرا کے پھر آئے

مخدوش جو رہیں تھیں وہ شفاف ہوئی ہیں
وہ ہاتھ وہ ان چھوٹی سی تلوار وکھا پرتو
سرپٹ میں وہ یک رنگی اسپانِ سبک رو
چلتی تھی غضب تیز ہوا دشتِ بلا میں
تیروں کو جو چلوں میں کمانداروں نے جوڑا
دونوں نے بزرگوں کے طریقے کو نہ چھوڑا
تلواروں کی گھاٹوں میں شناور رہے دونو

گر برق کہوں برق میں یہ تاب کہاں ہے
آئینہ میں جوہر ہے پہ یہ ذاب کہاں ہے
خم ہے پہ دم ایسا تو مہِ نو میں نہیں ہے
ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھ کے بھاگے
نامرد فراقِ سر و تن دیکھ کے بھاگے
دریا یہ بھی ڈر سے کوئی پھرا نہیں جاتا
بڑھ کر سپر اس بھائی نے کاٹی تو سر اس نے
صدر اس نے کیا چاک تو کاٹی کمر اس نے
مطلب تھا کہ نہ عمر کو نہ زید کو چھوڑیں

ایمان کا وہ دین کے آئینے کا مشتاق
جوئندہ وہ دم کا یہ لہو پینے کا مشتاق
جوشن سے اسے لاگ اسے بیر سپر سے
اعدا کا لہو خاک پہ برسا کے پھر آئے
دم لیکے لہو پیکے صفیں کھا کے پھر آئے

کیا ہاتھ منجھے ہیں کہ صفیں صاف ہوئی ہیں
چلنے میں جو بجلی تو ٹھہرنے میں ہے نو
دو ہاتھ جدھر چل گئے سر اڑ گئے سو سو
کیا چیز تھے پتّے ثمر اڑتے تھے ہوا میں
تیر آئے تو بد کیشوں نے منہ سہم کے موڑا
صف ایک نے الٹی تو پرا ایک نے توڑا
موجیں بھی جو آئیں تو برابر رہے دونوں

پانی میں روانی ہے پہ یہ آب کہاں ہے
آتش ہے تو آتش میں بھلا آب کہاں ہے
ایسی تو چمک مہر کی پرتو میں نہیں ہے
حیدر کی لڑائی کا چلن دیکھ کے بھاگے
بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھ کے بھاگے
بھاگڑ میں یہ ہے شور کہ ٹھہرا نہیں جاتا
زخمی کیا دشمن کا دل اس نے جگر اس نے
دکھلائے علی کے چلن اس نے ہنر اس نے
دو شیر جب ایسے ہوں تو کب صید کو چھوڑیں

کیا دخل جو قابو میں سوار آ کے نکل جاے
کیا جان جو بھاگڑ میں جگہ پا کے نکل جاے

کیا تاب جو گھوڑا کوئی چمکا کے نکل جاے
کیا منہ ہے جو تلوار کوئی کھا کے نکل جاے

جز کنج لحد اور کہیں امن نہیں تھا
پٹکا جسے رہتی پہ وہ پیوند زمیں تھا

یہ شوکت اسپان سبکرو نہیں دیکھی
یہ جست یہ سرعت یہ تگ و دو نہیں دیکھی

گردوں پہ یہ تنویر مہ نو نہیں دیکھی
چلتی ہوئی تلواروں میں یہ ضو نہیں دیکھی

کالا تھا جو دن دھوپ بھی سیاہ ہوئی تھی
لشکر کی سیاہی شب مہتاب ہوئی تھی

تھا شور کہ دریا یہ روانی نہیں رکھتا
یہ کاٹ کسی تیغ کا پانی نہیں رکھتا

خنجر کوئی یہ تیز زبانی نہیں رکھتا
ایک ایک وہ یکتا ہے کہ ثانی نہیں رکھتا

جدا ان کا اُٹھاتا تھا پیمبر کے علم کو
یہ چھین کے لے جائینگے لشکر کے علم کو

بہتے ہوئے دریا کی روانی ہے انھیں میں
یاں کند ہیں سب تیز زبانی ہے انھیں میں

بجلی کی طرح شعلہ فشانی ہے انھیں میں
جو آگ کو بھڑکاے وہ پانی ہے انھیں میں

موجوں کا طلاطم ہے کہ فوجیں لب جو کی
ٹاپو ہے وہ لاشوں کا یہ ندی ہے لہو کی

بہتے ہوئے دریا کا بھی کیا زور گھٹا ہے
ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگھور گھٹا ہے

مقتل میں برستا ہے لہو زور گھٹا ہے
تلواریں برستی ہیں سلح شور گھٹا ہے

ڈوبی ہوئی ہے خوں میں پڑی فوج عدو کے
بوچھار سروں کی ہے ڈریرے میں لہو کے

سینوں کو سنانوں سے ملا دیتے ہیں دونوں
ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتے ہیں دونوں

آئینۂ نصرت کو جلا دیتے ہیں دونوں
پانی اُنھیں تیغوں کا پلا دیتے ہیں دونوں

یوں مرتے ہیں گرتے ہیں ترائی جو جھلوں سے
تھا نہر ہلاہل کہ اُترتا تھا گلوں سے

بے دست تھا نیزوں کو اُدھر جس نے اُٹھایا
جاں اُس کی گئی زخم جگر جس نے اٹھایا

ضرب اُس پہ چلی فوج میں ہر جس نے اُٹھایا
پہونچے سے اُڑا ہاتھ تبر جس نے اُٹھایا

کیسے قدر انداز خطا کار کہاں کے
ترکش تھا نہ چلّہ تھا نہ گوشے تھے کماں کے

چھوٹا تھا بڑے بھائی سے خونریز زیادہ
سرخیز زیادہ شر رانگیز زیادہ
حیدر کی شجاعت بھی جلالت بھی غضب بھی
بڑھ آئے کمیں سے جو کماندار سمٹ کر
تھرّاتے تھے ڈر سے جو خطا کار سمٹ کر
سر کٹ گئے اب شکل کہاں امن و اماں کی
سر ایک سے لڑنے میں وہ چند ایک نے کاٹے
سب حلقۂ گیر آئے کمند ایک نے کاٹے
جانباز یاں دیکھیں کہ جگر داری کو دیکھیں
باندھا کسی برچھیت نے نیزے کا اگر بند
نعرہ تھا کہ ہم عقدہ کشا کے ہیں جگر بند
بھولے ہو تم اس پر کہ تنومند نہیں ہیں
تلواروں میں ہر دم سپر اک بھائی کی تھا ایک
رہواروں میں تھا ایک سے چالاک سوا ایک
دیکھا اُنھیں جس نے تو ہوئے ہوش گم اُس کے
غل تھا کہ نہ دیکھی تھی وغا آج تک ایسی
دوزخ کے بھی شعلوں میں نہ ہوگی لپک ایسی
آفت تھی قیامت تھی اُسے یا اسے دیکیں
وہ غل عربی باجوں کا تیغوں کی وہ جھنکار
کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دھواں دھار
ہاں آج نمودِ سپہ شام کا دن ہے

کچھ ہاتھ بھی کچھ نیمچہ بھی تیز زیادہ
اُس گھوڑے سے گھوڑا بھی سبک خیز زیادہ
غصّہ بھی تہور بھی برادر کا ادب بھی
پہونچے وہیں شہزادوں کے رہوار سمٹ کر
چلّے بھی اُتر جاتے تھے ہر بار سمٹ کر
نیزوں کے نہ وہ نخل نہ شاخیں تھیں کماں کی
تیر ایک نے اور نیزوں کے بند ایک نے کاٹے
قلموں کی طرح پائے سمند ایک نے کاٹے
جعفر ہوں تو ان ہاتھوں کی طیاری کو دیکھیں
واکر دیا بس ناخنِ تدبیر سے ہر بند
کھولیں اُسے خیبر سا اگر ہو کوئی در بند
یہ ہاتھ کسی معرکہ میں بند نہیں ہیں
اک ہوتا تھا بے تاب جو ہوتا تھا جدا ایک
چلنے میں ہوا ایک تو اُڑنے میں ہما ایک
نعل اس کے نہ لگتے تھے زمیں پر نہ سُم اُس کے
آفت کسی لشکر پہ نہ ڈالے فلک ایسی
زائل ہوئی جاتی ہے بصارت چمک ایسی
دو بجلیاں گرتی ہیں برابر کسے روکیں
قرنا کی صدا وہ کہ ہلے گنبدِ دوار
بڑھ بڑھ کے یہ کڑکیت صدا دیتے تھے ہر بار
اے لشکریو نام کرو نام کا دن ہے

اے فوجِ ظفر موج کے جرّار جوانو
یہ وقت کے ہیں جعفرِ طیّار جوانو
پہنچے بھی یہ کاٹیں گے مروڑیں گے علم کو
جس غول پہ جس صف پہ چلے نیمچے ان کے
کشتہ کیا گنتی کی سواروں کو جو گن کے
فوجیں وہ کہاں اور کہاں تشنہ دہاں وہ

یہ کہتے تھے لشکر کا نشاں دو تواماں دیں
ہاں صلح کی حضرت کو زباں دو تواماں دیں
خونِ پسرِ سعد بہا دو تو رکیں ہم
بتلا دو ہمیں خونیِ خونخوار کدھر ہے
ارزق جسے کہتے ہیں وہ مکّار کدھر ہے
ہم نیمچہ چمکا کے بڑھاتے ہیں فرس کو

تھرّاتے ہیں سُن سُن کے یہ نعرے وہ جفا جو
کہتا تھا کہ ان بچّوں میں ہے شیر کی خو بو
آفت ہیں مددگار ہو رنجوں سے بچاؤ
یہ سنتے ہی سب شام کا بادل اُمنڈ آیا
اک ظلم کا دریا سوئے مقتل اُمنڈ آیا
پاس آ کے لڑا ایک اُس فوجِ عدو میں

زخمی ہوئے جب شیر تو لشکر میں در آئے
وہ نیمچے جب سن سے کسی غول پر آئے
دونوں کے فرس ابر کہیں برق کہیں تھے
دو شیر کے بچے ہیں یہ ہشیار جوانو
لشکر کے نشانوں سے خبردار جوانو
پنجہ جو بڑھایا تو نہ چھوڑیں گے علم کو

بے جاں ہوئے وہ وار چلے دونوں پہ جن کے
تھرّانے لگے دانتوں میں سب آب کے تنکے
دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا کہ اماں دو
دُنیا کی محبت پہ نہ جان دو تواماں دیں
اصغر کو جو یہ آبِ رواں دو تواماں دیں
ہاں شمر کا سر کاٹ کے لا دو تو رکیں ہم

شبث ابنِ ربعی سا جفاکار کدھر ہے
کیوں حرملۂ سرکش و غدّار کدھر ہے
ہاں بھیجا ہے میداں میں سناں ابنِ انس کو
ڈھالوں میں چھپا تھا پسرِ سعدِ سیہ رو
ٹکڑے مرے کر دیں گے اگر پائیں گے قابو
یارو مجھے ان شیروں کے پنجوں سے بچاؤ

اک دَل کا ہٹانا تھا کہ اک دَل اُمنڈ آیا
نیزوں کا نیستاں تھا کہ جنگل اُمنڈ آیا
نہلا دیا بوچھار نے تیروں کی لہو میں
آفت ہوئی برپا غضب آیا جدھر آئے
ہاتھ اُڑ کے گئے واں تو ادھر کٹ کے سر آئے
دستانے کہیں خود کہیں فرق کہیں تھے

تیغوں نے دل اُس فوجِ بد آئین کے توڑے
ہاتھ آیا تو بازو کسی بے دین کے توڑے

چھینٹیں بھی اُدھر خون کی نہروں کی اُڑا ہیں
بیٹھیں تھیں پسِ پردہ اِدھر زینبِ ناچار
بے تابی میں فضّہ سے یہ فرماتی تھیں ہر بار
کھائے ہیں ابھی زخم نہ گھوڑوں سے گرے ہیں

نکلی جو عصا تھام کے وہ خیمے کے باہر
چلنے میں قدم کانپتے تھے ضعف سے تھرتھر
کیونکر یہ نہ ہو خادمۂ آلِ عبا تھی
شہزادوں کی سب معرکہ آرائی بھی دیکھی
دانائی بھی غربت بھی شکیبائی بھی دیکھی
شیروں کو لہو میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا

روتی ہوئی خیمے میں جو آئی وہ دل افگار
کی عرض نہیں تو ابھی لڑتے ہیں وہ جرّار
وہ کونسا یکتا ہے جو چو رنگ نہیں ہے
بے سر اُسے کرتے ہیں جسے پاتے ہیں دونوں
ڈھالوں کی گھٹا میں کبھی گھر جاتے ہیں دونوں

کس حشم کی پتلی میں وہ کاوا نہیں پھرتا
لاکھوں تو بلائیں ہیں وہ بچے کسے ٹالیں
زرہوں پہ نہ چار آئنہ نہ ہاتھوں میں ڈھالیں
تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی

گویا کہ پرے خیبر و صفّین کے توڑے
جھنجلائے تو لشکر کے نشان چھین کے توڑے

کیا دھجیاں علموں کے پھریروں کی اُڑا ہیں
چہرہ تھا کبھی زرد کبھی سُرخ تھے رخسار
تو دیکھ تو پہونچے ہیں کہاں تک مرے دلدار
معلوم یہ ہوتا ہے کہ فوجوں میں گھرے ہیں

خم تھی کمر اور مُنہ عرقِ شرم سے تھا تر
ہلتا تھا ضعیفی کے سبب سے سرِ انور
برقع نہ عصا یہ نہ قضا یہ نہ ردا تھی
جرأت بھی جلالت بھی توانائی بھی دیکھی
جانبازی بھی مظلومی بھی تنہائی بھی دیکھی
آگے جو بڑھیں تیر بھی کھاتے ہوئے دیکھا

زینب نے کہا قتل ہوئے کیا مرے دلدار
آفت ہے بپا بھاگتے پھرتے ہیں جفاکار
سب کہتے ہیں طوفان ہے یہ جنگ نہیں ہے
سب ہٹتے ہیں جب نیچے جھکاتے ہیں دونوں
لڑ بھڑ کے بھی صاف نکل آتے ہیں دونوں

یوں پھرتے ہیں گھوڑے کہ چھلاوا نہیں پھرتا
تلواریں اُدھر ہیں تو اُدھر نیزوں کی بھالیں
مہلت نہیں جو سینوں سے تیروں کو نکالیں
بہتا ہے جو بھائی کا لہو روتا ہے بھائی

قایم رہے ان بھائیوں کی خلق مین جوڑی
الٹا جو پرا اس نے تو صف اس نے بھی توڑی
تیور وہی آواز وہی آن وہی تھی
ساونت ہیں ان اپنے خوزادوں کی ہیں واری
تلواریں بھی ان نیمچوں سے ہو گئیں آری
بچے کہیں اس شان سے توسن پہ چڑھے ہیں

چھایا ہوا تھا چار طرف شام کا بادل
تلواریں علم ہاتوں میں تھیں ابروؤں پر بل
ایک ایک کی آنکھیں تھیں کہ دو ساغرِ خوں تھے
تیغیں وہ کہ منہ لوہے کی ڈھالوں سے نہ موڑیں
ہم پنجہ ہو رستم تو کلائی کو مروڑیں

ہر دم تھا اشارہ پسرِ سعدِ لعیں سے
تلوار اٹھا کر جو چلے عونِ دلاور
للہ نہ فرمایئے تکلیف برادر
لڑ لیں اگر ان دونوں کو لڑنے کی ہوس ہے
بی بی وہ جلالت مجھے بھولے گی نہ وہ شان
بھائی نے جو خاطر سے کہا خیر مری جان
دکھلا دیئے انداز وغائے اب وجد کے

اک ضرب میں ہاتھ اس کے اڑائے تو سر اس کا
ٹکڑے تھا دل اس کا تو لہو تھا جگر اس کا
دم بھر میں نہ غرہ تھا نہ شورش رہی سر میں

ہل چل تھی ادھر باگ جدھر رخش کی موڑی
چھوٹے نے کوئی بات علی کی نہیں چھوڑی
نعرے وہی توقیر وہی شان وہی تھی
حملوں میں ہے شوکت اسد اللہ کی ساری
خود غیرتِ گلشن تو فرس بادِ بہاری
میں نے تو یہ جانا کہ علی رن پہ چڑھے ہیں
میں بھی وہیں لڑنے کے لیے آے جو دو یل
نعروں سے فلک گونج اٹھا ہل گیا جنگل
کچھ مرحب و انتر سے بھی دل بر میں فزوں تھے
نیزے وہ قیامت کہ دلِ کوہ کو توڑیں
حملہ کریں جس پر نہ سلامت اسے چھوڑیں
اک نیزے میں دونوں کو اٹھا لیتے ہیں زیں سے
چھوٹے نے یہ کی عرض بڑے بھائی سے بڑھکر
آئے ہیں تو جاتے ہیں کہاں اب یہ ستمگر
بھیا یہ غلام آپ کا ان کے لئے بس ہے
ای شبر کے بچے تری ہمت کے میں قربان
گھوڑے کا اڑانا تھا کہ بس لے لیا میدان
غل تھا کہ غزال آ گئے پنجے میں اسد کے
اس نخل کی شاخیں تھیں ندارد ثمر اس کا
دم سینے سے نکلا ادھر اس کا ادھر اس کا
ساتھ آئی تھی اور ساتھ گئی قعرِ سقر میں

سُن کر یہ بیاں شاد ہوئیں زینبِ خوش خو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سب بی بیاں بولیں کہ یہ ہے آپ کا اقبال
پرواہ رہی تو قیر نہ بیٹے حشمت و اجلال
بھائی کے سوا مجکو نہیں فکر کسی کی

یہ ذکر ابھی تھا کہ صدا رونے کی آئی
لُوٹی گئی ہے ہے پھوپی امّاں کی کمائی
روتے ہوئے عباس بھی ہمراہ گئے ہیں
یہ سُنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینبؓ
طالب تھی ہیں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب
لٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچالے

کِس منہ سے ترا شکر کروں بارِ خدایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا نہ دکھایا
عالم میں جو دکھ ان کے لیئے میں نے بھرے ہیں
فضّہ کی صدا آئی کہ اے پیٹنے والو
روتی ہیں کہاں بانوی عالم کو بُلا لو
مقتل سے حسین ابنِ علی لائے ہیں لاشے

در تک گئی ناموسِ نبی کھولے ہوے سر
اک لاش کو لائے تھے علمدارِ دلاور
جنباں تھی زمیں غل تھا یہ فریاد و بکا کا
پھر جوشِ محبّت سے رہا دل پہ نہ قابو
میدان سے سر کے نہیں اب تک مرے گلرو
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

اُن دونوں کا سوچو تو ابھی کیا ہے سن و سال
فرمایا کہ ہاں صاحبِ غیرت ہیں مرے لال
عزّت ہے وہ مر جائیں ہیں طالب ہوں اسی کی
دروازے سے اکبر نے یہ آواز سنائی
مارے گئے دو ساتھ کے کھیلے ہوے بھائی
خود لاشیں اُٹھانے کے لیئے شاہ گئے ہیں

سجدے سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب
سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
سب قتل ہوں یہ تو مرے بھائی کو بچالے
تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
جو رتبۂ اعلائے شہادت ہے وہ پایا
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

سب مل کے آرہے میرے خوزادوں کو سنبھالو
لُوٹا گیا گھر خاکِ عزا بالوں پہ ڈالو
سیدانیوں ڈیوڑھی پہ چلو آے ہیں لاشے
لاشوں کو لیے خیمے میں داخل ہوے سرور
لپٹائے تھے چھوٹے کو گلے سے شہِ صفدر
ہلتا تھا کلس خیمۂ سُلطانِ شہدا کا

ماتم تھا کہ برباد یہ گھر ہو گیا ہی ہی
کس کی نظرِ بد کا گزر ہو گیا ہی ہی
تقدیر میں سر پیٹنا تھا نوحہ گری تھی

لاشوں کو شہِ دیں صفِ ماتم پہ جو لائے
زینب نے نہ فریاد کی نہ اشک بہائے
لب خشک تھے منہ زرد مژہ اشکوں سے تر تھی

بانو جو قریب آئی تو بولی یہ وہ مغموم
کس جا علی اکبر ہیں کدھر ہیں شہِ مظلوم
پردیس میں جینے سے کیسے یاس ہوئی ہی

عرصہ ہوا بچوں کو مرے رن میں سدھارے
دھڑکا ہی کہ کمسن ہیں بہت وہ مرے پیارے
سر دے کے پھریں دھوم ہو ثابت قدمی کی

بولے یہ بصد درد علی اکبرِ ذی شاں
شبیر پکارے کہ بہن ہیں ترے قرباں
فوجوں کو بھگایا ہی ہزاروں سے لڑے ہیں

ہوش آ گیا زینب کو صدا بھائی کی سُن کر
خوشنود ہیں آقا تو رضامند ہی مادر
یہ آپ پہ قربان ہوئے راہِ خدا میں

حضرت نے کہا رو لو گلے ان کو لگا کر
پانی نہ پیا نزع میں بھی برچھیاں کھا کر
کس سے کہوں جیسے یہ وفادار پسر تھے

زہرا کے نواسوں کا سفر ہو گیا ہی ہی
یہ چاند ہر اک خون میں تر ہو گیا ہی ہی
خالی ہوئی وہ گود جو بچوں سے بھری تھی

سب اہلِ حرم پیٹتے روتے ہوئے آئے
بیٹھی ہیں سرِ زانوئے اقدس پہ جھکائے
نہ اپنی نہ بھائی کی نہ لاشوں کی خبر تھی

بی بی مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم
کس کی خبر آئی ہی کہ ماتم کی ہی یہ دھوم
یہ کونسی ماں بیٹوں سے بے آس ہوئی ہی

کیا جانیے سر ماموں پہ وارے کہ نہ وارے
دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے
میں دودھ نہ بخشوں گی جو لڑنے میں کمی کی

حاضر ہی یہ محجوب غلام اے پھوپی امّاں
زندہ تھا سحر تک مگر اب میں ہوا بے جاں
یہ عون و محمد ہیں جو بے جان پڑے ہیں

کی عرض یہ سب آپ کا صدقہ ہی برادر
لو بخش دیا دودھ انھیں یا شہِ صفدر
نام ان کے خدا عرش پہ لکھے شہدا ہیں

اب پاس تمھارے نہیں یہ آئیں گے جا کر
رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر
دم نکلے تو دونوں کے مرے پاؤں پہ سر تھے

بانو نے رکھے زانوے زینب پہ سر ان کے
زینب نے جو کی جھک کے رخ خوں پہ نظر ان کے
جو بی بیاں بیٹھیں آ گئے منہ کو جگر ان کے
دکھلائی دیئے چاند سے منہ خوں میں تر ان کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
ہوتا ہے بیاں شوکت و ہمت کا تمہاری
آرام میں ہو یا ہے غشی پیاس کی طاری
تسلیم کرو قبلۂ کونین کو واری
سمجھی ہیں کہ باعث ہے یہ بیداریِ شب کا
پیارے یہ طریقہ نہیں اربابِ ادب کا

تعریف امام دوسرا کرتے ہیں اٹھو
ہمشکل نبی مدح و ثنا کرتے ہیں اٹھو
عباس علمدار ثنا کرتے ہیں اٹھو
سب لوگ نہ اٹھنے کا گلا کرتے ہیں اٹھو
آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

تم تو کہیں یوں رات کو غافل نہیں سوئے
اب تم نہ ملو گے جو کوئی جان بھی کھووے
پانی نہیں کاہے سے یہاں چہروں کو دھووے
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ماں لاشوں پہ روے
سر دے کے مرے حق سے ادا ہو کے پھرے ہو
سمجھی ہیں کہ ماموں پہ فدا ہو کے پھرے ہو

احسنت مرے صف شکنو نیک خصالو
غش آتا ہے پیارو مجھے اٹھ اٹھ کے سنبھالو
گل پیرہنو تشنہ لبو گیسوؤں والو
لو چھوٹی سی باہیں تو گلے میں مرے ڈالو
مظلوم ہو دربار میں عادل کے سدھارو
جاتے ہو تو اماں کے گلے مل کے سدھارو

پیارو تم اکیلے کبھی نکلے نہیں گھر سے
راہیں بھی وہ خالی نہیں جو خوف و خطر سے
رستے سے نہ واقف نہ صعوباتِ سفر سے
جو خاصۂ باری ہیں وہ تھرّاتے ہیں ڈر سے
اس خوف سے راتوں کو نہ سوتے تھے محمدؐ
جب موت کا ذکر آتا تھا روتے تھے محمدؐ

بھولی نہیں اب تک مجھے بے تابیِ حیدرؑ
دالان سے جاتے تھے کبھی حجرے کے اندر
دم بھر شبِ ضربت کو نہ تکیہ پہ رکھا سر
روتے ہوئے حجرے سے کبھی آتے تھے باہر
اٹھتی تھی جب آواز بکا آتی تھی مجھکو
اعضا کے لرزنے کی صدا آتی تھی مجھکو

میں عرض یہ کرتی تھی کہ یا شاہِ خوش انجام
کیا ہے کہ نہ لیٹے نہ کیا آپ نے آرام
فرماتے تھے کس طرح نہ تھرّائے یہ ناکام
سرکار سے آیا ہو جیسے موت کا پیغام
وہ کون ہے اعمال کا دھڑکا نہیں جس کو
درپیش ہے وہ راہ کہ دیکھا نہیں جس کو

بیٹی میں ہزاروں سے رہا معرکہ آرا
مرحب کو تہِ تیغ کیا عمر کو مارا
تھا پیر علم آگ سے دوزخ کا کنارا
کودا میں تو لشکر تہ و بالا ہوا سارا
کلمہ تھا مرے ڈر سے زبانوں پہ جنوں کی
ہر ضرب میں بن جاتی تھی جانوں پہ جنوں کی

کس سے کہوں جو آج مجھے خوف ہے طاری
جو ہڈیاں ہیں تن میں گھلی جاتی ہیں ساری
مجرم کے لیے قبر کی منزل بھی ہے بھاری
وہ تنگ مکاں رحم کرے خالقِ باری
لب کھل نہیں سکتے ہیں زباں ہل نہیں سکتی
کروٹ بھی بدلنے کو جگہ مل نہیں سکتی

قہار کی جانب سے جو ہیں حکم پہ معمور
نرمی و ترحم نہیں اُن لوگوں کا دستور
بیزار بدی سے عمل خیر سے مسرور
نہ رفق و مدارا نہ رعایت اُنھیں منظور
آنکھیں وہ دکھائیں گے جو خاموش رہونگا
واقف نہیں کیا پوچھیں گے اور کیا میں کہونگا

ہے ہاے وہی رستہ تمھیں درپیش ہے پیارو
تم مرد ہو جرّار ہو ہمّت کو نہ ہارو
اب آنکھوں سے چھپ جاؤ گے اے عرش کے تارو
بچّو مجھے منزل کا پتا دے کے سدھارو
ویرانے میں یا گلشنِ ہستی میں رہو گے
تم آج کی شب کونسی بستی میں رہو گے

تجویز ہے قبروں کی کہاں میں نہیں آگاہ
غربت میں مرو گے یہ نہ تھی مجکو خبر آہ
یہ دہر ہے بے مہر یہ دنیا ہے گزرگاہ
جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ
ماموں کی نہ تقصیر نہ کچھ اس میں ہے ماں کی
قبریں بھی ملیں گی وہیں ہے خاک جہاں کی

یہ پھول سے تن اور وہ سر تیز سنانیں
وہ تیر قیامت کے غضب کی وہ کمانیں
گل برگ سے ہونٹوں پہ ہیں خشکیدہ زبانیں
نکلیں کہو کیونکر تنِ مجروح سے جانیں
رخ زرد ہیں اور خاک سے گیسو بھی اٹے ہیں
مرتے ہوئے تڑپے ہو کہ سب زخم پھٹے ہیں

کیا تھی خبر اس کی کہ جدا ہوؤ گے بچّو
پردیس میں دنیا سے مجھے کھوؤ گے بچّو
بیداری میں گزرینگے کہ سونے میں کٹیں گے
اب جینے سے امّاں کا بھی دل سیر ہے پیارو

تم مر گئے دنیا مجھے اندھیر ہے پیارو
ہے کونسی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں
اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
پردیس میں اب ماں کی خبر کون رکھے گا

سب ہوں گے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے
ہر سال بہار آئے گی کھل جائیں گے سب گل
سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسریں کہیں سنبل
دنیا کے نہ بستانِ فرحناک میں ہوگے

حضرت کو لڑائی کے پیام آتے ہیں اٹھو
لو تیرِ ستم سوئے امام آتے ہیں اٹھو
جلدی سے قباؤں کو پہنتے ہوئے نکلو
تاریکی میں واری تمھیں نیند آئے گی کیونکر

مادرِ دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیونکر
نکلوں جو تجسس کو تو بیجا نہیں واری
تم دونوں نے جاں اپنی مرے بھائی پہ واری
کس منہ سے شہیدوں میں کروں شکر گزاری

بہتر ہوا گر مجھ پہ چھری چل گئی پیارو
میں روؤں گی اور تم نہ مجھے روؤ گے بچّو
تڑپوں گی میں اور قبر میں تم سوؤ گے بچّو
اب زیست کے دن مجھے رونے میں کٹیں گے

جیتی ہوں پہ قسمت کا مرے پھیر ہے پیارو
کیا جانیں مری موت میں کیا دیر ہے پیارو
معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں
الفت کی محبّت کی نظر کون رکھے گا

جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا
اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے
سرسبز جوانانِ چمن ہوئیں گے بالکل
وہ سرد ہوائیں وہ خوش الحانیِ بلبل

گل باغ میں۔ تم زیرِ زمیں خاک میں ہوگے
خیمے کی طرف سا کنِ شام آتے ہیں اٹھو
جرّار بُرے وقت میں کام آتے ہیں اٹھو
شمشیر و سپر تھام کے تنتے ہوئے نکلو

شب ہوگی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیونکر
واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری
شرمندۂ احساں ہے یہ دکھ درد کی ماری

ماں پہلے تھی پر آج سے لونڈی ہوں تمھاری
کچھ تو مرے بھائی کی بلا ٹل گئی پیارو

اس دائی نے کی تھی گلہ آمیز جو تقریر　　اُس وقت نہ تھی ہوش میں یہ بیکس و دلگیر
منظور یہ تھا پہلے ہو تم فدیۂ شبیر　　شرمندہ ہوں محجوب ہوں بخشو مری تقصیر
روتے تھے کہ امّاں میں خطا ہونے کی خو ہے　　گھُڑکا تھا کلیجہ مرا اس غم سے لہو ہے

چلتے ہوئے منظور تلافی تھی میں قربان　　رونے میں کچھ اُس کا نہ رہا مجھ کو ذرا دھیان
صدقے گئی جوڑتی ہوں ہاتھ میں اس آن　　نانی سے شکایت مری کیجو نہ مری جان
سمجھی تھی کہ فوجِ شہِ والا میں رہو گے　　کیا جانتی تھی آج نہ دُنیا میں رہو گے

جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ　　ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا بتاؤ　　بسترِ سرِ شام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی　　کیسی ہے زمیں جو تمھیں سونے کو ملے گی

ہمراہ نہ تکیے ہیں نہ راحت کا بچھونا　　دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا
معلوم ہے چھوٹے کا مجھے چونک کے رونا　　صدقے گئی غافل مرے بچے سے نہ ہونا
بے ماں کے سحر رونے میں ہو جاتی ہے اس کو　　پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اس کو

ٹکڑے تھے کلیجے یہ بیاں درد کا سن کر　　اک حشر تھا سیدانیاں سب پیٹتی تھیں سر
بانو نے کہا قبلۂ کونین سے اُٹھ کر　　مر جائے گی ماں لاشوں کو لے جایئے باہر
فرزند کا غم خالقِ عالم نہ دکھائے　　اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے

اکبر سے کہا تم پھوپی امّاں کو سنبھالو　　عباس کدھر ہیں اُنھیں باہر سے بلا لو
شہزادی کو غش آیا ہے اے پیٹنے والو　　ہے ہے نہ کرو خاکِ عزا سر پہ نہ ڈالو
پردہ ہو کہ لاشے نہ اُٹھاتے ہوئے دیکھے　　ماں خیمہ سے بچّوں کو نہ جاتے ہوئے دیکھے

کیا لاشوں کے جانے کا کہوں حال انیس آہ　　در تک گئے سب پیٹتے روتے حرمِ شاہ
اللہ ہی زینب کی مصیبت سے ہے آگاہ　　گزرے کسی مادر پہ نہ یہ صدمۂ جاں کاہ
بالائے زمیں عرش کے تاروں کو نہ دیکھا　　غش سے جو کھلی آنکھ تو پیاروں کو نہ دیکھا

مرثیہ (۸)

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی
غل تھا کہ شبِ قتلِ شہِ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غمِ جاں کاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی
ہو چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغانِ ہوا بر میں طپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اُداسی تھی نجف میں

صدمے سے ہوا رنگِ رُخِ ماہ جو کافور
اختر بھی بنے مردمکِ دیدۂ بے نور
غم چھا گیا راحتِ دلِ عالم سے ہوئی دور
تصویرِ الم بن گئی جنت میں ہر اک حور
کہتے تھے ملک رات نہ ہووے گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی تھی نہ تاریک شب ایسی

شمعِ طربِ محفلِ عالم تھی جو خاموش
تھی رات بھی شبیرؑ کے ماتم میں سیہ پوش
کیا غم تھا کہ شادی بھی تھی ہر اک دل کو فراموش
ہر چشم کو تھا غم میں سمندر کی طرح جوش
مضطر تھے علی اشکوں سے منہ دھوتی تھی زہرا
مقتل تھا جہاں شاہ کا واں روتی تھی زہرا

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہِ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اُجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اُڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے
تھا چین بجبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

بچوں کے بلکنے پہ حرم کرتے تھے زاری
غش ہوگئی تھی بالی سکینہ کئی باری
چلاتی تھی رو رو کے وہ شبیر کی پیاری
یا حضرتِ عباس چلی جان ہماری
افسوس کہ پانی کا تو قطرہ نہیں گھر میں
اور آگ لگی ہی مرے ننھے سے جگر میں

تھی سب سے سوا بنتِ علی مضطر و بیتاب
فق ہوگیا تھا شام سے منہ صورتِ مہتاب
مژگاں سے رُخِ پاک پہ تھی بارشِ خوناب
تلوار کلیجے پہ چلے جب تو کہاں تاب
اک کرب تھا بسمل کی طرح جانِ حزیں پر
اُٹھتی تھی کبھی اور کبھی گرتی تھی زمیں پر

کہتی تھی کبھی آج پیمبر نہیں ہی ہی
حال اپنا دکھاؤں کسے حیدر نہیں ہی ہی
بیٹی پہ فلک ٹوٹا ہی مادر نہیں ہی ہی
شبیر مصیبت میں ہی شبّر نہیں ہی ہی
دیکھا نہ سُنا یہ جو ستم آج ہی لوگو
نازوں کا پلا پانی کو محتاج ہی لوگو

درپیش ہی کل فوجِ ستمگر سے لڑائی
یاں تھوڑے سے پیاسے ہیں اُدھر ساری خدائی
بے سر دیئے رن سے نہ پھرے گا مرا بھائی
ہو جائے گی حیدر کے بھرے گھر کی صفائی
اس غم سے سدا اشکوں سے منہ دھوتی تھیں امّاں
کل دن وہ ہی جس دن کے لیئے روتی تھیں امّاں

تھے دوسرے خیمے میں اُدھر سبطِ پیمبرؑ
دربار میں حاضر تھے رفیقانِ دلاور
اِک پہلو میں قاسم تھے اور اک پہلو میں اکبرؑ
اکبرؑ کے اُدھر لختِ دلِ زینبِ مضطر
شبیرؑ محبت سے سخن کرتے تھے سب سے
عباسِ علیؑ سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مرجانے پہ سب شاہ کے انصار
عباس سے یہ کہتا تھا وہ کُل کا مددگار
تم رہیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار
ڈر ہی نہ کرے بے ادبی لشکرِ کفار
بے دینوں کو راحت مری منظور نہیں ہی
شب خوں جو اُدھر سے ہو تو کچھ دور نہیں ہی

یہ ذکر ابھی تھا کہ یکایک خبر آئی
ای چاند ید اللّٰہ کے شب دو پہر آئی
حضرت کو ستاروں کی جو گردش نظر آئی
دل یادِ خدا کرنے لگا چشم بھر آئی
فرمایا بڑا اجر ہی بیداری شب کا
ای تشنہ لبو وقت ہی یہ طاعتِ رب کا

اب عمر بھی آخر ہی نمازیں بھی ہیں آخر
ہر وقت ہی ربِّ دو جہاں حاضر و ناظر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
نام اُس کا رہے وِرد سفر ہو کہ حضر ہو
سجدے ہی کرتے کٹھن کی راتیں بسر ہو
عشقِ گلِ تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
چومے لبِ سوفار جو سینے پہ لگیں تیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشن تو قیر
کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے
شہ نے سخنِ معرفتِ حق جو سنائے
کچھ پیاس کا شکوہ بھی زباں پہ نہیں لائے
تکبیریں ہوئیں لشکرِ اللہ و نبیؐ میں
تسبیح نہیں تھی کہیں سجدے کہیں نہ اری
کرتا تھا کوئی عرض کہ یا حضرتِ باری
حرمت سے شریکِ شہدا کیجیو یا رب
ہم ہیں ترے محبوب کے پیارے کے مددگار
یہ بندۂ بیکس ہی مصیبت میں گرفتار
فاقوں کے سبب جسم کی طاقت میں کمی ہی
بیکس ہیں مسافر ہیں وطن دور ہی گھر دور
تیروں سے ہوں غربال کہ تیغوں سے بدن چور
پھر منہ کسے دکھلائیں جو سردار کو چھوڑیں

بے توشہ پہونچتا نہیں منزل پہ مسافر
اجر اُن کے مضاعف ہیں جو ہیں صابر و شاکر
بندہ وہی بندہ ہی جو بھولے نہ خدا کو
موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو
تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے
دم عشق کا بھرتا رہے زیرِ دمِ شمشیر
تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دمِ تکبیر
ہر رنگ میں بو الفتِ اللہ کی نکلے
اشک آنکھوں میں ہر عاشقِ صادق کے بھر آئے
سجادے وہیں لا کے دلبروں نے بچھائے
سب محو ہوئے یادِ جنابِ احدی میں
تھا صوتِ حسن سے کوئی قرآن کا قاری
اب صبح کو عزت ہی ترے ہاتھ ہماری
تو جو صابرِ صبر عطا کیجیو یا رب
مرنے کے لئے آئے ہیں یاں چھوڑ کے گھر بار
کر رحم کہ ہی ذات تری راحم و غفار
تجھ سے طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہی
ہفتم سے ہمیں گھیرے ہی یہ لشکرِ مقہور
احمدؐ کے نواسے سے جدائی نہیں منظور
کیونکر ترے مقبول کی سرکار کو چھوڑیں

مردوں کے لیئے ننگ ہی تلواروں سے ڈرنا
تو چاہے تو مشکل نہیں کچھ سر سے گزرنا
فاقوں میں ہزاروں سے وغا ہو تو مزا ہی

کرتے تھے مناجات اُدھر یاور و انصار
تھی ہیئتِ تسبیح بتولِ جگر افگار
اکبر سے اشارہ کیا مُڑ کر کہ یہ کیا ہی
یوں تو کئی راتوں سے وہ ہیں مضطر و بیتاب
غش میں جو ذرا بند ہوئے دیدۂ پُر آب
نعلین کہیں چادرِ پُر نور کہیں ہے

سب بیبیاں ہیں دور ہیں بچوں کو لیئے پاس
جو پوچھتا ہی وجہ تو کہتی ہیں بصد یاس
مانگو یہ دُعا غیب سے بیکس کی مدد ہو
اُن کا تو یہ احوال ہی اماں کا یہ عالم
اصغر کی بھی ہی فکر سکینہ کا بھی ہی غم
گودی میں بٹھائیں اُسے یا اس کو سنبھالیں

روتی ہیں عابد کے سرہانے کبھی جاکر
قرآن کی ہوا دیتی ہیں غش میں اُسے پاکر
وہ کہتی ہیں تا صبح یہ نہیں روؤں گی اماں
بتلاؤ شہِ جن و بشر کیوں نہیں آتے
آزردہ ہیں کچھ مجھ سے ادھر کیوں نہیں آتے
اب پیاسوں کی فریاد بھی بابا نہیں سنتے

راحت ہو کہ ایذا یہیں جینا یہیں مرنا
ای کُل کے مددگار مدد جنگ میں کرنا
کچھ حقِ نمک ہم سے ادا ہو تو مزا ہی

پڑھتے تھے نمازِ شب ادھر سیدِ ابرار
آوازِ بُکا خیمے سے آنے لگی یک بار
کی عرض پھوپی جان کے رونے کی صدا ہی
راحت کی نہ صورت ہی نہ آرام کے اسباب
روتی ہوئی چونکی ہیں ابھی دیکھ کے کچھ خواب
اُس وقت سے بسمل کی طرح چین نہیں ہی

اک ایک کو اندیشہ ہی اک ایک کو وسواس
لوگو مجھے شبیر کے بچنے کی نہیں آس
صدقے کرو مجکو کہ بلا بھائی کی رد ہو
اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے تھمتی نہیں اکدم
شش ماہ کا بچہ بھی ہوا جاتا ہی بے دم
دو روز کے فاقے میں وہ کس کس کو سنبھالیں

گہوارۂ اصغر پہ کبھی گرتی ہیں آکر
بہلاتی ہیں بیٹی کو کبھی اشک بہاکر
بابا ہی جب آئیں گے تو میں سوؤں گی اماں
اب رات بہت کم ہی پدر کیوں نہیں آتے
کیا آج وہیں سو رہیں گے گھر کیوں نہیں آتے
حضرت مرے رونے کی صدا کیا نہیں سنتے

روکر علی اکبرؑ نے جو کی شہ سے یہ تقریر
دیکھی جو نہ تھی دیر سے وہ چاند سی تصویر
بیتاب جو پایا بہت اُس تشنہ دہن کو
فرمایا بہن تم نے بنایا ہے یہ کیا حال
ماتھا ہے بھرا خاک سے بکھرے ہوئے ہیں بال
دم تن سے مرا گھٹ کے نکل جائے گا زینبؓ

جیتا ہوں میں اور آہ ابھی سے یہ تلاطم
ہوتے ہیں مرے ہوش و حواس آئے ہوئے گم
بس صبر کرو جی سے گزر جائیں گے بچّے
تلوار کسی نے ابھی تولی نہیں مجھ پر
گردن پہ کسی نے ابھی پھیرا نہیں خنجر
ہر چند کہ ساعت نہیں ٹلتی ہے قضا کی

زینبؓ نے کہا خوش ہوں جو میری اجل آئے
خالق نہ مجھے عابد کی یتیمی نہ دکھائے
وسواس طبیعت کو بہلنے نہیں دیتا
آتا ہے سکینہ کی یتیمی کا مجھے دھیان
سمجھانے سے کچھ دل جو بہلتا ہے میں قربان
بازو مرے کسنے کو رسن لاتا ہے کوئی

منہ ڈھانپ کے بستر پہ جو سو جاتی ہوں دم بھر
امّاں کبھی چلاتی ہیں یوں کھولے ہوئے سر
کیا لیٹی ہے بستر پہ کدھر دھیان ہے زینبؓ

پڑھتے ہوئے تسبیح گئے حضرتِ شبیرؑ
قدموں پہ محبت سے گری دوڑ کے ہمشیر
شبیرؑ نے لپٹا لیا چھاتی سے بہن کو
نہ سر پہ عصابہ ہے نہ چادر ہے نہ رومال
بھیّو نہیں جیتا ہے ابھی فاطمہؓ کا لال
رو لیجیو جب رونے کا وقت آئے گا زینبؓ

یہ کرب یہ دکھ درد یہ زاری یہ تظلّم
خنجر کے تلے دیکھو گی کس طرح مجھے تم
تڑپو گی تم اس طرح تو مر جائیں گے بچّے
سینہ ابھی تیروں سے مشبّک نہیں خواہر
مر جائے گا بھائی تمھیں ثابت ہوا کیونکر
بچ جاؤں تو کیا دور ہے قدرت سے خدا کی

بھائی تمھیں للہ اس آفت سے بچا لے
بھائی کی بلا لیکے بہن خلق سے جائے
مجبور ہوں دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتا
ہر وقت بھرا گھر نظر آتا ہے ویران (یہ نسخہ [illegible])
پھر جاتا ہے آنکھوں کے تلے موت کا سامان
سر پر سے ردا چھیننے لئے جاتا ہے کوئی

تو چاک گریبان نظر آتے ہیں پیمبرؐ
بیٹی نہ بچے گا ترا مظلوم برادر
شبیرؑ اسی رات کا مہماں ہے زینبؓ

یہ ذکر ابھی تھا کہ سکینہ نے پکارا
میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا
نیند آئی ہے بیٹی کو سُلا جائیے بابا
سُونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
گردوں پہ چمکنے نہ لگے صبح کا تارا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قربان
غربت میں کہاں راحت و آرام کا سامان
اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان
بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمھیں ہم کہیں پائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
مجبور ہوں ایسے کہ تمھیں چھوڑ کے جائیں
بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سُلائیں
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یونہیں ماں سے
کوچ اُن کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لیئے ہیں
سوتے تھے لپٹ کر یوں ہی خاتونِ جناں سے
ماتم سے ملیں وہ نہ بُکا سے نہ فغاں سے
ماں باپ زمانے میں صدا کس کے جیئے ہیں

رستہ وہ اجل کا ہے کہ ہوتا ہی نہیں بند
ہوتا ہے قلق فرقتِ اولاد میں وہ چند
جو آئے ہیں دنیا میں وہ سب کوچ کریں گے
کوچ آج پدر کا ہے تو کل جائے گا فرزند
کیا زور ہے بندے کا جو مرضیِ خداوند
اس زیست کا انجام یہی ہے کہ مریں گے

یہ کہتے تھے حضرت کہ صدا آئی اذاں کی
اک دم میں بہار اور ہوئی باغِ جہاں کی
مہتاب ہوا گم فلکِ نیلوفری سے
گلدستۂ اسلام پہ بلبل نے فغاں کی
تلوار چلی گلشنِ انجم پہ خزاں کی
پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری سے

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا
اُس دشت میں روتی تھی جو شبنم شہِ دیں پر
مُرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دمِ صبح کا وہ نور کا عالم
سُرخی وہ شفق کی اُفقِ چرخ پہ کم کم
دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
وہ گل کے کٹوروں پہ وہ افشانیٔ شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جناں تشنہ دہاں تھا

لشکر میں ادھر مورچے بندی کی ہوئی دھوم
پیچھے تو جماعت تھی اور آگے شہِ مظلوم
یاں فرض ادا کرنے لگے عاشقِ قیوم
صف بستہ ملائک ہیں یہی ہوتا تھا معلوم
سب ساجد و راکع تھے شہنشاہ کے ہمراہ
تاباں تھے بہتّر مہِ نو ماہ کے ہمراہ

خیمہ تھا فلک آپ قمر، دوست ستارے
تارے بھی وہ تاروں کو فلک جن پہ اُتارے
خم ہو گیا تھا پیرِ فلک شرم کے مارے
کہتی تھی زمیں اوج ہی طالع کو ہمارے
خورشید نہیں روشنیٔ نیرِّ دیں ہے
خود عرش کو دھوکا تھا یہ میں ہوں کہ زمیں ہے

جو صف ہے وہ اک سطر ہے قرآنِ مبیں کی
کیا خوب جماعت ہے یہ اربابِ یقیں کی
دیوار ہے قبلہ کی طرف کعبۂ دیں کی
افلاک کی زینت ہے تو رونق ہے زمیں کی
کس طرح شہنشاہ سے وہ فوج جدا ہو
مشکل ہے کہ دریا سے کہیں موج جدا ہو

اُس دم تھی یہ آوازِ پسِ پردۂ قدرت
نہ پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقوں کی شکایت
اے قدسیو دیکھو مرے بندوں کی عبادت
یہ زہد یہ تقوے یہ اطاعت یہ ریاضت
کو بن میں ہیں یہ صاحبِ اقبال و شرف ہیں
عالم ہوں کہ ان لوگوں کے دل میری طرف ہیں

کس عجز سے آگے مرے حاضر ہیں یہ بندے
مظلوم ہیں بیکس ہیں مسافر ہیں یہ بندے
دیکھو مرے محبوب کے ناصر ہیں یہ بندے
تھوڑے ہیں نہ ہوں کس طرح کہ شاکر ہیں یہ بندے
صادق ہیں ولی سے مرے ان سب کو ولا ہے
ان کا وہ صلہ ہے جو رسولوں کو ملا ہے

پرسش نہ لحد میں نہ حساب ان کے لیے ہے
موتی سے جو ہے صاف وہ آب ان کے لیے ہے
یہ لائقِ رحمت ہیں ثواب ان کے لیے ہے
میں جن کا ہوں ساقی وہ شراب ان کے لیے ہے
اس نخلِ ریاضت کے ثمر ان کو ملیں گے
جو عرش سے نیچے ہیں وہ گھر ان کو ملیں گے

فارغ جو صلوٰۃ سحری سے ہوئے دیندار
پوشاک پہننے کو اُٹھے سیدِ ابرار
فرمانے لگے حضرت عباسؑ علمدار
ہاں غازیو اب تم بھی سجو جنگ کے ہتھیار
قرباں تمھیں ہونا ہے محمدؐ کے پسر پر
کمروں کو کسو گلشنِ جنت کے سفر پر

آمادۂ شر لشکرِ کفّار ہے کل سے
ہونا ہے تمھیں آج ہم آغوشِ اجل سے
درپیش ہے جنگ و جدل اس فوج کے دل سے
آقا بھی کوئی دم میں نکلتے ہیں محل سے
ہاں صف شکنو! وقت ہے نصرت کی دعا کا
کھلتا ہے پھریرا علمِ فوجِ خدا کا

ہم لوگ اسی روز کے مشتاق ہیں کب سے
اب ہوگی ملاقات شہنشاہِ عرب سے
سیدانیاں تم سب کو دعا دیتی ہیں شب سے
صف باندھکے آؤ درِ دولت پہ ادب سے
فردوس میں نانا سے حضور آج ملیں گے
کوثر پہ تمھیں خلعتِ نور آج ملیں گے

اِس مژدہ کو سنتے ہی مسلّح ہوئے غازی
اصطبل سے آنے لگے جرّاروں کے تازی
شبیرِ صفِ جنگاہ تھا اک ایک نمازی
نعرے تھے کہ "قربانِ شہنشاہِ حجازی"
ڈیوڑھی پہ شگفتہ تھا چمن خلدِ بریں کا
خیمے میں تلاطم تھا وداعِ شہِ دیں کا

تھے گردِ حرم بیچ میں وہ عاشقِ حق تھا
مانندِ سحر رنگ ہر اک بی بی کا فق تھا
بانوئے دو عالم کا جگر سینے میں شق تھا
زینب یہ تڑپتی تھی کہ حضرت کو قلق تھا
شبیرؑ کے پہلو سے نہ ہٹتی تھی سکینہ
بڑھتے تھے تو دامن سے لپٹتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں اب جانے دو گھر سے
سینہ مرا شق ہوتا ہے لپٹو نہ پدر سے
وہ کہتی تھی سایہ جو یہ اُٹھ جائے گا سر سے
یہ کہہ کے میں تمھیں ڈھونڈھ کے لاؤں گی کدھر سے
بیٹی کا سوا آپ کے کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا

سمجھاتے تھے حضرت کہ میں صدقے مری پیاری
میداں سے ابھی آئیں گے ہم تو کئی باری
وہ کہتی تھی میں آپ کی مظلومی کے واری
ساماں نظر آتا ہے یتیمی کا ہماری
درپیش لڑائی نہیں گر فوجِ شقی سے
کیوں آپ سفارش مری کرتے تھے پھوپھی سے

اب آپ کے جانے سے تو ثابت ہے نہ آنا
بانو مرے پیچھے نہ سکینہ کو رُلانا
بہلائیو جب رو کے مجھے یاد کرے گی

میں سُنتی تھی عابد سے جو کچھ کی تھی وصیت
ہے ہے یہ مری عمر یہ صدمہ یہ مصیبت
ساتھ آپ کے جاؤں گی جو اس وارِ محن سے

نادان کی ان باتوں پہ گھر روتا تھا سارا
حضرت کو بھی فرقت تھی نہ بیٹی کی گوارا
جس دم وہ چھٹی جیتے ہی جی مر گئے شبیر

جس دم درِ دولت پہ امیرِ امم آیا
تسلیم کو اسلام کا لشکر بہم آیا
جاتی تھی چمکنے میں ضیا عرش تک اُس کی

آپس میں یہ کہتے تھے رفیقانِ دلاور
اکبر کے تو ہے نام پہ سالاریِ لشکر
اک عشق ہے اُس شیر سے سلطانِ اُمم کو

زینبؑ کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم
تائیدِ خدا چاہیئے گو عمر میں ہیں کم
واقف ہیں سبھی حیدر و جعفر کے شرف سے

دادا بھی علمدار ہے نانا بھی علمدار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار
عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں

کیوں کہتے تھے زینب اسے چھاتی پہ سُلانا
پانی جو میسّر ہو تو پیاس اس کی بجھانا
تڑپوں گا لحد میں جو یہ فریاد کرے گی

اس گھر کی تباہی کی خبر دیتے تھے حضرت
لے لو مجھے ہمراہ گوارا نہیں فرقت
کوئی مری گردن تو نہ باندھے گا رسن سے

ماتم میں کسی دل کو نہ تھا صبر کا یارا
ڈیوڑھی تک اُسے گود سے اپنی نہ اُتارا
کس درد سے روتے ہوئے باہر گئے شبیرؑ

بیٹھے یہ حرم گھر میں کہ ہونٹوں پہ دم آیا
کس صولت و اقبال و حشم سے علم آیا
خورشید کو پنجے میں لیئے تھی چمک اُس کی

دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہے کس پر
عباس کو دیں گے شہِ دیں منصبِ جعفر
بھائی کو کبھی دیکھتے ہیں گاہ عَلَم کو

کیوں بھائی عَلَم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار
ہیں بادشہِ کون و مکاں مالک و مختار
چُپکے رہو اماں نہ کہیں سُن کے خفا ہوں

مطلب نہ علم سے نہ حشم سے ہمیں کچھ کام
یہ سر ہو نثار قدمِ شاہِ خوش انجام
آقا سے جو چاہیں علمِ فوجِ خدا دیں
روتی تھی جو پردے کے قریں زینبِ دلگیر
فضہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحبِ توقیر
کچھ کہنا ہے سن لیں اُسے فرصت اُنھیں گر ہو
یہ کہتی تھی زینب کہ خود آئے وہ نکوکار
کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں اے مرے دلدار
سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے
اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤں گی بیزار
کیا دخل تمھیں امر میں سلطانِ امم کے
کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے
استادہ ہو جا کر عقبِ شاہ ادب سے
اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
دو روز سے بھائی پہ مرے ظلم و ستم ہے
چھوٹے سے ہیں قد سن بھی تمھارا ابھی کم ہے
ہرگز نہ ابھی کچھ شہِ ذی جاہ سے کہنا
مانا کہ بہو پہنچتا ہے تمھیں منصبِ جعفر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کروگے

مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ ہے یہی نام
عزت یہ ہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام
مشتاقِ اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں
سب اس نے مفصل یہ سنی بیٹوں کی تقریر
دونوں کو اشارے سے بلا لے کسی تدبیر
عباسؑ نہ دیکھیں نہ شہِ دیں کو خبر ہو
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ ناچار
اس وقت میں ہو کون سے منصب کے طلبگار
گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے
بچو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار
کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے شب سے
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علی کی
تم فکرِ علم میں ہو مجھے سخت الم ہے
کھیل اس کو نہ سمجھو یہ محمدؐ کا علم ہے
کہنا بھی تو رخصت کے لئے شاہ سے کہنا
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر
عاشق کا تو معشوق ہے برادر کا برادر
عباسؑ سے کیا تم مجھے محجوب کروگے

زینب نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار
شاہوں سے غلاموں نے بھی کی ہے کبھی تکرار
رخصت کے لیے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
زینب نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو
ماں صدقے گئی سر قدمِ شاہ پہ وارو
یہ وقت ہے امدادِ امامِ ازلی کا
صدقے گئی سن لو کہ میں کہتی ہوں جتا کر
میدان میں زخمی ہوئے گر قاسم و اکبرؑ
جب دل ہوا ناراض تو فرزند کہاں کے
اُن میں سے اگر رن کی طرف ایک سدھارا
جس وقت سنوں گی کہ سر اُن دونوں پہ وارا
بیجاں ہوئے بعد اُن کے تو ماتم نہ کروں گی
ہیں دونوں بھتیجے مرے پیارے مرے محبوب
جینا نہیں بہتر کسی صورت کسی اسلوب
ایذا جو اُٹھاؤ گے تو راحت بھی ملے گی
دیکھو کہے دیتی ہوں خبردار! خبردار!!
شیروں کے یہ ہیں کام کھچے جس گھڑی تلوار
توڑی ہیں صفیں جنگ میں جب کھیت پڑے ہیں
اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ
جعفر کی طرح جوہرِ شمشیر دکھاؤ
خورشیدِ امامت سے قرابت میں قریں ہو

یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ دلدار
مالک ہیں جسے چاہیں علمِ دیں شہِ ابرار
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں
بس اب مرا دِل شاد ہوا ای مرے پیارو
ہو عید مجھے گر عمرو شمر کو مارو
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زورِ علی کا
تم پہلے فدا کیجیو سر شہ کے قدم پر
پھر تم مرے فرزند نہیں دونوں کی مادر
کس کام کے وہ لال جو کام آئیں نہ ماں کے
زہرا کی قسم مُنہ نہ میں دیکھوں گی تمھارا
اُس وقت تمھیں ہوگا مرا دودھ گوارا
دیکھو جو مرو گے بھی تو ناراض رہوں گی
تم اُن پہ تصدّق ہو یہی ہے مجھے مطلوب
بے سر دیئے دودھ اپنا میں بخشوں تمھیں کیا خوب!
جب آئیں گی لاشیں تو یہ دولت بھی ملے گی
جینے جو رہے دودھ نہ بخشوں گی میں زنہار
رکھ دیویں گلا بڑھ کے تہِ خنجرِ خوں خوار
جنّات کے لشکر سے علی یوں ہیں لڑے ہیں
اجلالِ حسن شوکتِ شبیر دکھاؤ
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھاؤ
تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفرؑ سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو
جرّار ہو کرّار ہو صفدر ہو دلبرو
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ
خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو
تیغوں میں دھنسو چھاتیوں سے نیزوں کو ریلو
دو اور جلا آئینۂ تیغِ عرب کو

خاقاں کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج
چڑھنا ہی لڑائی پہ جواں مردوں کو معراج
یوں آیئو چار آئنہ پہنے ہوئے بر میں
میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں
گہ عطر میں ڈوبے ہیں گہے خون میں تر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں

یہ سُن کے جو نکلے وہ جری خیمے سے باہر
اکبرؑ نے یہ کی عرض کہ ای سبطِ پیمبر
جلدی ہی لڑائی کی اُدھر فوجِ ستم کو
شہ بولے کہ عباسِ دلاور کو بلاؤ
عاشق کو مددگار کو یاور کو بلاؤ
یہ اوج یہ رتبہ یہ حشم اُس کے لیئے ہی

سب تکنے لگے صورتِ عباسِ فلک جاہ
یعنی مرا حامل ہی نشانِ اسد اللہ
جاں آگئی تھی سُنتے ہی اس خوش خبری کو
حیدرؑ سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو
ضرغام ہو ضیغم ہو غضنفر ہو دلیرو
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

بچے اسد اللہ کے ہو جان پہ کھیلو
کوفے کو تہِ تیغ کرو شام کو لے لو
لو روم کو قبضہ میں تو قابو میں حلب کو
ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج
گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
جس طرح علیؑ بعد ظفر آئے تھے گھر میں

جس کے ہیں یہ اُس کے ہیں جدھر ہیں یہ اُدھر ہیں
صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں
کس پیار سے منہ دونوں کا تکنے لگے سرور
تیار ہی سب قبلۂ کونین کا لشکر
ارشاد جسے ہو وہ بڑھے لیکے علم کو

پیارے مرے محبوب برادر کو بلاؤ
جلدی مرے حمزہ مرے جعفر کو بلاؤ
زیب اُس سے علم کی ہی علم اس کے لیئے ہی
نازاں ہوا خود اوج پہ اپنے علمِ شاہ
بالیدہ تھا پرچم تو پھریرا تھا ہوا خواہ
پنجہ بھی اشارے سے بلاتا تھا جری کو

خوش ہو کے یہ عمّو کو پکارے علی اکبرؑ
جلد آئیے یاد آپ کو فرماتے ہیں سرور
حاضر ہوا جوڑے ہوئے ہاتھوں کو وہ صفدر
ارشاد کیا شہ نے علَم بھائی کو دے کر
رکھیے اسے کاندھے پہ یہ ہے آپ کا عہدہ
لو بھائی مبارک ہو تمھیں باپ کا عہدہ

بوسہ دیا عباسؑ دلاور نے علَم پر
تسلیم کی اور رکھ دیا سر شہ کے قدم پر
کی عرض کہ قربان اس الطاف و کرم پر
سو سر ہوں تو صدقے ہیں شہنشاہِ اُمم پر
ادنیٰ جو ابھی تھا اُسے اعلیٰ کیا مولا
قطرے کو ترے فیض نے دریا کیا مولا

اس چتر فلک قدر کا سایا مرے سر پر
اس دھوپ میں ہوگا یہ پھریرا مرے سر پر
یہ ابر مرے سر پہ یہ طوبا مرے سر پر
قایم رہیں لاکھوں برس آقا مرے سر پر
سلطانِ دو عالم کی غلامی کے صلے ہیں
سب اَوج یہ نعلین اُٹھانے سے ملے ہیں

حضرت نے کہا رو کے یہ کیا کہتے ہو پیارے
حاضر ہے اگر جان بھی کام آئے تمھارے
حصّہ یہ تمھارا تھا سو پہونچا تمھیں بارے
مالک ہو تمھیں ہم تو ہیں اب گور کنارے
تھا دل میں جو کچھ وہ بخدا ہو نہیں سکتا
بھائی ترا حق مجھ سے ادا ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کے بڑھے سرورِ دیں جانبِ توسن
ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن
اسوار ہوئے آپ جو گرداں کے دامن
اللہ ری ضیا خانۂ زیں ہو گیا روشن
وہ پاؤں رکابوں کے لیئے باعثِ ضَو تھے
خورشید کے قدموں کے تلے دو مہِ نو تھے

رانوں کے اشارے سے لگا کوندنے شبدیز
اسوار کے دل کا تھا اشارا اُسے مہمیز
گرما کے جو شبیرؑ نے تازی کو کیا تیز
اعدا پہ چلا غول سواروں کا جلو ریز
ایک ایک جوانِ عربی رشکِ ملک تھا
اللہ کے لشکر کا علَم سر بہ فلک تھا

کیا فیض سواری تھا کہ زر ریز تھی سب راہ
طالع تھا اُدھر مہر اِدھر تھا علَمِ شاہ
مابین دو خورشید تھی فوجِ شہِ ذیجاہ
پنجہ پہ تجلّی تھی کہ اللہ ہی اللہ
بالا تھی چمک مہرِ منوّر کی چمک پر
ضَو اس کی زمیں پر تھی ضیا اس کی فلک پر

ایک ایک جواں زیورِ جنگی کو سنوارے
جعفر کے جگر بند ید اللہ کے پیارے
سیّاف ہو مرحب سا تو شمشیر سے مارے

کمسن کئی لڑکوں کا جدا غول تھا سب سے
روکے ہوئے باگوں کو شہِ دیں کے ادب سے
ہتھیار جو باندھے تھے تو کیا تن پہ کھلے تھے

وہ چاند سے منہ اور وہ گورے بدن اُن کے
یوسف کی طرح عطر فشاں پیرہن اُن کے
کیا حُسنِ عقیدت تھا عجب دل کے جواں تھے

عمریں تو کم و بیش پہ سب گیسوؤں والے
ذی مرتبہ سیدانیوں کے گود کے پالے
اُن تازہ نہالوں میں نمودار یہی تھے

مقتل کو جو پُر نور کیا عسکرِ دیں نے
اونچا نہ کیا سر فلکِ ماہ جبیں نے
اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے
تاروں کو اُتارا فلکِ نیلوفری نے
عیسیٰ نے پکارا کہ نثار اس کے حشم کے

ترتیب صفِ فوج کا جس دم ہوا اعلام
ظاہر جو ہوئی شانِ جوانانِ گل اندام
اللہ ری شوکت شرفا و نجبا کی

نیزوں کی چمک اور وہ سمندوں کے طرارے
رستم سے ہر اک جنگ کرے شیر کو مارے
ارجن سے کماندار کو اک تیر سے ماریں

سوئے بھی نہ تھے ولولۂ جنگ میں شب سے
اعدا کی طرف دیکھتے تھے چشمِ غضب سے
سب تیغچے تولے ہوئے مرنے پہ تُلے تھے

شرمندہ ہوں غنچے بھی وہ نازک دہن اُن کے
مر کر وہی کپڑے ہوئے آخر کفن اُن کے
آقا پہ فدا ہونے کو سب ایک زباں تھے

اک غول میں تھے چاند کئی اور کئی ہالے
غنچہ تھا وہ سب اکبرِ گلرو کے حوالے
اُس گلشنِ یک رنگ کے مختار یہی تھے

دیکھا طرف چرخ حقارت سے زمیں نے
کی فرش پہ حسرت سے نظر عرشِ بریں نے
خورشید کے پہلو کو دبانے لگے ذرّے

لوٹے گلِ فردوس نسیمِ سحری نے
پرچم جو کھلا کھول دیے بال پری نے
خورشید نے منہ رکھ دیا پنجہ پہ علم کے

باندھی علی اکبر نے صفِ لشکرِ اسلام
کوفہ کے نشاں جھک گئے کانپی سپہ شام
اسلام کا لشکر تھا کہ قدرت تھی خدا کی

ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکرِ سفاکؔ
فریاد سے قرنا کی ہلا گنبدِ افلاک
نوبت تھی زِبس قتلِ امامِ مدنی کی
واں شور تھا باجوں کا ادھر نعرۂ تکبیر
ناگاہ سوے فوجِ خدا آنے لگے تیر
کی عرض کہ لڑنے کو شریر آتے ہیں مولا
شہ نے کہا شرم آتی ہے کیا حکم میں دوں آہ
غازی نے یہ کی عرض کہ اے گُل کے شہنشاہ
لاکھوں ہوں تو کیا ڈر ہے شجاعانِ عرب کو
فرمایا کہ فاقے سے ہے سارا مرا لشکر
بہتر ہے اگر پہلے کٹے تن سے مرا سر
حملوں سے اُلٹ دیں گے پرے فوجِ عدو کے
حضرت نے کہا خیر لڑو فوجِ ستم سے
دنیا سے نہ مطلب ہے نہ کچھ جاہ و حشم سے
مقبول ہیں وہ جو مری امداد کریں گے
جس دم یہ سنی قبلۂ کونین کی گفتار
تھے پیاسوں کے حملے غضب حضرتِ قہار
کون آنکھ ملا سکتا تھا شیروں سے عرب کے
لڑتا تھا غضب ایک کے بعد ایک وفادار
سر بیچتے تھے جنسِ شہادت کے طلبگار
لیکن پہلے ہم ایک ایک کی جاں ہی پہ لڑی تھی

تا چرخ گیا غلغلۂ کوسِ شغبؔ ناک
تھرّا گیا آوازِ دہل سے کرۂ خاک
صاف آتی تھی شاخوں سے صدا سینہ زنی کی
ایک ایک جری جھومتا تھا تول کے شمشیر
عباسِ علمدار نے دیکھا رُخِ شبیرؑ
کیا حکم ہے اب پیاسوں پہ تیر آتے ہیں مولا
ہفتاد و دو تن یاں ہیں اُدھر سیکڑوں گمراہ
یہ شیرِ نیستانِ علی ہیں تو وہ روباہ
اقبال سے آقا کے بھگا دیتے ہیں سب کو
پانی نہیں ملتا کہ لبِ خشک کریں تر
غازی نے کہا شبّرِ گرسنہ ہیں یہ صفدر
بھوکے ہیں یہ زخموں کے یہ پیاسے ہیں لہو کے
معلوم ہے سب آج جدا ہووینگے ہم سے
کٹ جائے گا اپنا بھی گلا تیغِ دو دم سے
اِس جنگ کو بھی لوگ بہت یاد کریں گے
جانباز بڑھے فوج سے چلنے لگی تلوار
چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے ہتھیار
جب کرتے تھے نعرے قدم اُٹھ جاتے تھے سب کے
دن چڑھتا تھا یاں گرم تھا واں موت کا بازار
بڑھ بڑھ کے خریدار پہ گرتا تھا خریدار
عقبےٰ کا جو سودا تھا تو قیمت بھی کڑی تھی

آیا جو عزیزوں کے لیئے موت کا پیغام
فرزندوں نے جعفر کے بڑے رن میں کیئے نام
اولادِ عقیل آ چکی شبیر کے جب کام
لڑنے کو گئے مسلمِ بیکس کے گل اندام
تھا حشر بپا ندیاں بہتی تھیں لہو کی
بچوں نے الٹ دی تھیں صفیں فوجِ عدو کی

لشکر میں تلاطم تھا غضب چلتی تھی تلوار
بیتاب تھے یاں زینبِ ناشاد کے دلدار
منہ دیکھ کے حضرت کا یہی کہتے تھے ہر بار
ہم جائیں گے بعد اُن کے سوئے لشکرِ کفار
جی جائیں جو مولا ہمیں مرنے کی رضا دیں
ایسا نہ ہو قاسم کو حضور اذنِ وغا دیں

کچھ اُن سے کہا چاہتے تھے سرورِ ذیشاں
جو غل ہوا مارے گئے مسلم کے دل و جاں
لاشے بھی ادھر آ چلے جب خوں میں غلطاں
پھر ہاتھوں کو جوڑا کہ ملے رخصتِ میداں
شہ نے کہا یہ داغ تو دشوار ہے ہم پر
اُن دونوں نے سر رکھ دیئے ماموں کے قدم پر

حضرت نے کہا ماں سے بھی ہو آؤ رخصت
کیا کہتے ہو لٹواؤں میں ہمشیر کی دولت
مایہ ہو تمھیں اُس کا تمھیں اُس کی بضاعت
چھوٹے نے یہ حضرت سے کہا تھام کے رقت
چھوٹے نہیں ہم آپ ابھی پوچھ لیں سب سے
اماں تو رضا دے چکیں ہیں مرنے کی شب سے

بچوں نے جو کی جوڑ کے ہاتھوں کو یہ تقریر
اُن دونوں کا منہ دیکھ کے رونے لگے شبیرؑ
فرمایا چھوڑا تا ہے تمھیں بھی فلکِ پیر
اچھا میں رضامند ہوں جو مرضیِ ہمشیر
وہ سیدۂ پاک نواسی ہے نبی کی
فیاض کی ہمشیر ہے بیٹی ہے سخی کی

یہ سُن کے جھکے آخری تسلیم کو ذی جاہ
خورشید کے آگے مہِ نو بن گئے دو ماہ
کی سوئے فلک دیکھ کے شبیر نے اک آہ
دو شیر چلے گھوڑوں پہ چڑھ کر سوئے جنگاہ
ماں ڈیوڑھی سے چلائی کہ رخصت ہو مبارک
سرکارِ شہنشاہ سے خلعت ہو مبارک

سلطانِ دو عالم نے مخلّع کیا واری
تم جاتے ہو یا جاتی ہے دولہ کی سواری
پروان چڑھے ختم ہوئیں شادیاں ساری
لو دور سے لیتی ہوں بلائیں میں تمھاری
صدقے گئی نیزوں کو ہلاتے ہوئے جاؤ
شکلیں مجھے پھر پھر کے دکھاتے ہوئے جاؤ

تسلیم کو گھوڑوں سے جھکے دونوں وہ گلرو
باگیں جو اٹھائیں تو فرس بن گئے آہو
میداں کی طرف یاس سے ماں رہ گئی تک کے
میدان میں عجب شان سے وہ شیرِ نر آئے
غل پڑ گیا حضرت کی بہن کے پسر آئے

یوسف سے فزوں حسنِ گراں مایہ ہی اُن کا
وہ چاند سے مُنہ اور وہ گیسوئے معنبر
سب شان یداللہ کی سب شوکتِ حیدر
یہ دبدبہ کس صاحبِ شمشیر نے دیکھا
تن تن کے جو شان اپنی دکھاتے تھے وہ ذیجاہ
شمشاد سے قامت نہ دراز اور نہ کوتاہ

ناخن میں دلیروں کے سب اندازِ وغا تھے
تھے حسن میں ان دونوں کے آئینہ رو ایک
شان ایک شکوہ ایک جبے رنگ ایک تھی بو ایک
اور اُن سا کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہی
پڑھنے لگے اشعارِ رجز جب وہ دلاور
ہر بیت تھی دشمن کے لئے تیغِ دو پیکر
دے کون جواب اُن کا کہ دم بند تھا سب کا
اظہارِ نسب میں جو محمد کا لیا نام
آگے جو بڑھے نامِ علی لیکے وہ گلفام
جعفر کا جو کچھ ذکر کیا بعد علی کے

دلِ ماں کا یہ اُمڈا کہ ٹپکنے لگے آنسو
پھر دیکھنے پائی نہ اُنھیں زینبِ خوشخو
پنہاں ہوئے بدلی میں ستارے سے چمک کر
گویا کہ بہم حیدر و جعفر نظر آئے
افلاک سے بالائے زمیں دو قمر آئے

یہ دھوپ بیاباں میں نہیں سایہ ہی اُن کا
وہ بدر سے رخسار زہے قدرتِ داور
چتون وہی غصہ وہی سارے وہی تیور
دیکھا جسے معلوم ہوا شیر نے دیکھا
چھاتی سے لگا لیتے تھے دونوں کو یداللہ
کھیلے ہوئے تیغوں میں فنِ جنگ سے آگاہ

بچے تھے مگر بچہ ضرغامِ خدا تھے
پیشانی و ابرو و سر و صدر و گلو ایک
دلِ ایک جگر ایک جسد ایک لہو ایک
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہی
اللہ ری فصاحت فصحا ہو گئے ششدر
ہر مصرعۂ برجستہ میں تھی تیزیِ خنجر
واں قافیہ تھا تنگ شجاعانِ عرب کا
سب پڑھنے لگے صلِّ علیٰ صاحبِ اسلام
دِل ہل گئے تھرّانے لگا روم سے تا شام
مجرے کو علم جھک گئے سب فوجِ شقی کے

آغاز تھا ذکرِ شرفِ حضرتِ شبیرؑ
اُس وقت بڑے بھائی سے کی چھوٹے نے تقریر
کہیے تو جدا ہو کے ستمگاروں پہ جائیں
فرمایا بڑے بھائی نے ہنس کر نہیں بھائی
ہو جاتی ہے اک آن میں ہر صف کی صفائی
بازو ہوں قوی ہاتھ سے گر ہاتھ نہ چھوٹے
نانا کی طرح فوج پہ حملے کریں آؤ
ان چھوٹے سے ہاتھوں کا ہمیں زور دکھاؤ
ہم شیروں پہ رستم کا بھی منہ پڑ نہ سکے گا
چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ بہتر
دو بجلیاں کوندیں کہ لرزنے لگا لشکر
برباد کیا روئیں سواروں کو دبا کے
ان چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے
مسل اپنی جمائے تھے جو بے مثل رسالے
ناز اپنے ہنر پر تھا شجاعانِ عرب کو
موت آئی اُدھر نیمچے دونوں جدھر آئے
گہہ سینے تک آئے تو کبھی تا کمر آئے
ہر نیمچہ بجلی تھا ستمگاروں کے حق میں
اُٹھتی تھی نہ ڈر سے کسی خونخوار کی گردن
دو چار کے منہ کٹ گئے دو چار کی گردن
دو نیمچے بجلی سے گزرتے تھے کمر سے

ڈنکے پہ اُدھر چوب لگی چلنے لگے تیر
تلوار عَلَم کیجیے اب کس لئے تاخیر
اسواروں پہ ہم آپ کمانداروں پہ جائیں
تم جان ہو دشوار ہے دم بھر کی جدائی
کر دیتے ہیں سر کو سنی ایسی ہے لڑائی
سر تن سے اُتر جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے
تلواروں میں تن تن کے چلو برچھیاں کھاؤ
ہم سینہ سپر تم پہ ہوں تم ہم کو بچاؤ
جب دو ہوئے اک دل تو کوئی لڑ نہ سکے گا
بس کھینچ لئے نیمچے دونوں نے برابر
نیزوں کے نیستاں میں در آئے دو غضنفر
رہوار بھی اسوار تھے گھوڑوں پہ ہوا کے
تھیں کہنیاں پہنچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
تھے جائزہ اُن سب کا ہی دیکھنے والے
نیزوں کو قلم کر کے ندارد کیا سب کو
جب ہاتھ بڑھا پاؤں پہ کٹ کٹ کے سر آئے
خالی نہ پھرے جس پہ گئے خوں میں بھر آئے
ڈوبے ہوئے تھے دو مہِ نو خوں کی شفق میں
سر خود کا جھک جاتا تھا تلوار کی گردن
اسوار کا سر اُڑ گیا رہوار کی گردن
آدھے ہوئے جاتے تھے لعیں جان کے ڈر سے

دو چھوٹی سی تیغوں سے قیامت نظر آئی | معصوموں کے ہاتھوں سے کرامت نظر آئی
سر کٹنے کی اعدا کے علامت نظر آئی | لوہے کی سپر بھی نہ سلامت نظر آئی
بے وجہ نہ پھر جاتے تھے منہ اہلِ جفا کے | دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے

گردن سے بڑھے کاٹ کے پیکر نکل آئے | جوشن کو دکھاتے ہوئے جوہر نکل آئے
چار آئینہ میں تیر کے باہر نکل آئے | صابون سے دو تار برابر نکل آئے
محراب کے نیچے کسے جھکتے نہیں دیکھا | مچھلی کو بندھے پانی میں کٹتے نہیں دیکھا

ہر غول میں غلطاں و تپاں تھے سر و پیکر | دستانے کہیں تھے کہیں ڈھالیں کہیں مغفر
جب نیچے ان دونوں کے اُٹھتے تھے برابر | منہ خوف سے ڈھالوں میں چھپاتے تھے ستمگر
روکے انھیں طاقت یہ نہ تھی پیر و جواں کی | صورت نظر آنے لگی تیغِ دو زباں کی

غارت تھی وہ صف جس سے وغا کر کے پھرے وہ | دو ہاتھ میں سو سو کو فنا کر کے پھرے وہ
ہزاروں کے سر تن سے جدا کر کے پھرے وہ | ہر غول میں اک حشر بپا کر کے پھرے وہ
غل تھا کہ پرے ٹوٹے ہوئے جم نہیں سکتے | سر کٹنے کی دہشت سے قدم تھم نہیں سکتے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے | پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو سبک و تو اُدھر گرم عناں تھے | بجلی تھے کسی جا تو کہیں آبِ رواں تھے
ہو سکتی تھی بجلی سے یہ سرعت نہ ہرن سے | جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

بے آب تھے دو دن سے پہ جاندار تھے گھوڑے | ہر مرتبہ اُڑ جانے پہ طیار تھے گھوڑے
اس پار کبھی تھے کبھی اُس پار تھے گھوڑے | نقطہ تھی وہ سب فوج کہ پرکار تھے گھوڑے
دَل بیٹھ جو مر جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے | بڑھ سکتا نہ تھا ایک احاطہ سے اجل کے

تانے ہوئے سینوں کو جدھر جاتے تھے دونوں | تلواروں کی موجوں سے گزر جاتے تھے دونوں
ہر غول میں بے خوف و خطر جاتے تھے دونوں | سب ہٹتے تھے پسپا تو ٹھہر جاتے تھے دونوں
اُلٹی ہوئی صف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی | بھائی کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی

دم لیکے جو گھوڑوں کو اُڑاتے تھے وہ جرّار
شیروں کی طرح فوج پہ جاتے تھے وہ جرّار
شیروں نے جو مارا ابھی تو رو داروں کو مارا
جمعیتِ لشکر کو پریشاں کیا دم میں
تلواروں سے جنگل کو گلستاں کیا دم میں
بے دست تھے علموں کو جو بے دین لیئے تھے
دو لاکھ کو دونوں نے کیا تھا تہ و بالا
اک بڑھ گیا گر ایک نے گھوڑے کو نکالا
یک جا فرسِ تیز قدم ہو گئے دونوں
وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا
جب شیر سا پہونچا وہ اُدھر یہ ادھر آیا
بچ بچ کے نکلتے تھے جو نیزوں کے تلے سے
کچھ بھائی سے بڑھکر جو وغا کرتا تھا بھائی
حق بھائی کی اُلفت کا ادا کرتا تھا بھائی
تم سا نہیں صفدر کوئی واللہ برادر
کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا بصد آداب
اب پیاس کی گرمی سے کلیجے کو نہیں تاب
ہم لوگ محق کیا نہیں اس آبِ رواں کے
کہتا تھا بڑا بھائی میں صدقے ترے گلفام
اب جلد اجل آئے تو کوثر کا پئیں جام
آنکھیں تو ستمگاروں کی تیغوں سے لڑی ہیں

اعدا کے رسالوں کو بھگاتے تھے وہ جرّار
دو کرتے تھے یکتا جسے پاتے تھے وہ جرّار
جب آنکھ ملی جن کے نموداروں کو مارا
جو فوج کی جاں تھے اُنھیں بے جاں کیا دم میں
سر کاٹ کے خونخواروں کو غلطاں کیا دم میں
بچوں نے جوانوں سے نشاں چھین لیئے تھے
تیغ ایک کی چلتی تھی تو اک بھائی کا بھالا
دم اس نے لیا اُس نے لڑائی کو سنبھالا
جب بھیڑ پڑی کچھ تو بہم ہو گئے دونوں
دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا
جاں آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے
بچ جانے کی بھائی کے دُعا کرتا تھا بھائی
ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی
کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر
بھائی میں بھگا دوں ابھی اُن کو جو ملے آب
سینے میں مرا دل نہیں آتش پہ ہے سیماب
تالو میں خلش ہوتی ہے کانٹوں سے زباں کے
ہم خشک زبانوں کو بھلا پانی سے کیا کام
غش ہم کو بھی آجائے گا پانی کا نہ لو نام
چپکے رہو اماں درِ خیمے پہ کھڑی ہیں

اِس نہر کا لینا تو کچھ ایسا نہیں مشکل
روکیں ہمیں کیا تاب لعینوں کی ہے کیا دل
پل باندھ لیں لاشوں کے ابھی ہم سرِ ساحل
بتلایئے پھر نہر کے لے لینے سے حاصل
دیکھو نہ اُدھر پیاس سے گو لاکھ تعب ہے
امّاں ہمیں گر وہ نہ بخشیں تو غضب ہے

اشک آنکھوں میں بھر کر کہا چھوٹے نے بہت خوب
ہر دم ہے رضامندیِ مادر ہمیں مطلوب
ایسے تو نہیں ہم کہ بزرگوں سے ہوں محجوب
منظور یہ تھا فخر کا نکلے کوئی اسلوب
دریا کو بھی دیکھیں گے نہ اب آنکھ اُٹھا کے
پیتے بھی تو پہلے شہِ والا کو پلا کے

جعفر کے جو پوتے ہیں تو حیدر کے نواسے
کچھ ہم علی اکبر سے زیادہ نہیں پیاسے
یہ کہتے ہی لڑنے لگے پھر اہلِ جفا سے
فریاد کہ بچّوں پہ گری فوج قضا سے
خوں سر کا بہا منہ پہ تو گھبرا گئے دونوں
دو لاکھ کی تیغوں کے تلے آ گئے دونوں

ڈوبے ہوئے تھے شام کے بادل میں وہ دو ماہ
پردے سے کھڑی تکتی تھی زینب سوئے جنگاہ
عباس سے کہتے تھے تڑپ کر شہِ ذی جاہ
اب مجھ سے جدا ہوتے ہیں دو شیر مرے آہ
کیونکر متحمل ہو دلِ اس رنج و محن کا
گھر لٹتا ہے بھائی مری نادار بہن کا

اس بی بی کے فاقوں کے ہیں پالے ہوئے یہ لال
دولت ہے یہی اور یہی حشمت و اقبال
سات آٹھ برس کے ہیں ابھی کیا ہے سن و سال
سب ہاتھ ملیں گے جو یہ گُل ہو گئے پامال
تازہ ہے وہ پھول ہیں جعفر کے چمن میں
مر جائے گا باپ اُن کی خبر سن کے وطن میں

رو کر دمِ رخصت وہ یہی کہتے تھے ہر بار
میں شاہ کا خادم ہوں یہ دونوں ہیں نمک خوار
آگاہ صعوباتِ سفر سے نہیں زنہار
اے دخترِ زہرا مرے بیٹوں سے خبردار
میں رکھ نہیں سکتا ہوں کہ ماموں پہ فدا ہیں
اب تو یہی دونوں مرے پیری کے عصا ہیں

شوہر کا تڑپنا اُسے کچھ بھی نہ رہا یاد
ہے ہے مری الفت میں لٹی زینبِ ناشاد
یوں بھائی پہ صدقے کوئی کرتا نہیں اولاد
ہم دیکھتے ہیں اور بہن ہوتی ہے برباد
روئے گی وہ بیٹوں کو تو سمجھائیں گے کیونکر
منہ زینبِ دلگیر کو دکھلائیں گے کیونکر

عبّاس نے کی عرض کلیجہ ہے دوپارا
زخمی ہوئے نہ مجھ کو نہ اکبر کو پکارا
حضرت کی قسم دے کے میں سمجھاؤں گا اُن کو

حضرت نے کہا صاحبِ غیرت ہیں وہ دونوں
ضرغامِ نیستانِ شجاعت ہیں وہ دونوں
دو لاکھ تو کیا ہیں جو کروروں میں گھریں گے

بڑھنے لگے میداں کی طرف قاسمِ ذیجاہ
ہے دونوں کی فرقت کا مجھے صدمۂ جانکاہ
ریتی پہ کہیں گر نہ پڑیں برچھیاں کھا کر

گھبرا کے درِ خیمہ سے زینب یہ پکاری
اولاد نہ مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری
میداں کی طرف قاسمِ بے پر بھی نہ جائیں

زہرا کی قسم کچھ نہیں بیٹوں کا مجھے دھیان
وہ آئے تو وسواس سے دل ہوگا پریشان
خود روؤں گی پر شاہ کو غم کھانے نہ دوں گی

میداں میں ہے کیا اور بجز نیزہ و شمشیر
دل کس کا چھدے تم کو لگا تیر جو کوئی تیر
باقی ہے اگر زیست تو پھر آئیں گے دونوں

شہزادوں کو کھوتے ہیں غلاموں کے لیے آہ
ہے شرم کی کیا وجہ میں لونڈی وہ شہنشاہ
ممتاز ہے قدر یہ ہے جو زہرا کے پسر کا

ان کو تو کسی کی نہیں امداد گوارا
جائے یہ غلام آپ جو فرمائیں اشارا
مچلیں گے تو گودی میں اُٹھا لاؤں گا اُن کو

لختِ جگرِ شاہِ ولایت ہیں وہ دونوں
واللہ بڑے صاحبِ ہمّت ہیں وہ دونوں
بے جان دیئے وہ نہ پھرے ہیں نہ پھریں گے

اکبر نے یہ کی عرض کہ میں جاتا ہوں یا شاہ
لاکھوں میں ہیں تنہا پھوپھی امّاں کے پسر آہ
میں ساتھ اُنھیں لے آتا ہوں اعدا کو بھگا کر

سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری
بتلاؤ کہ میں اُن کی ہوں عاشق کہ تمھاری
تلواروں میں عبّاس دلاور بھی نہ جائیں

بھائی پہ تصدّق ہوں یہی تھا مجھے ارمان
صدقے کو نہیں پھیر کے لاتے ہیں میں قربان
لاشے بھی اُٹھانے کے لیے جانے نہ دوں گی

مرجاؤں گی زخمی ہوئے گر قاسمِ دلگیر
سمجھاؤ میں صدقے گئی کیوں روتے ہیں شبّیر
غم کس لئے کیا ہوگا جو مر جائیں گے دونوں

میں جوڑتی ہوں ہاتھ بس اب روئیں نہ للہ
تو ایسے ہوں بیٹے تو نثارِ شہِ ذیجاہ
شان اُس کی بڑھے فخر ہو جو جدّ و پدر کا

باپ اُن کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا
بیٹوں کو یوہیں میری طرح نذر کو لاتا
جو پاس ہے جس کے وہ عطائے شہِ دیں ہے
بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جُدائی
اک دولتِ اولاد لٹائی تو لُٹائی
کیوں روؤں ہیں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلواروں کے مارے
پامالی کو ان دونوں کی اسوار بڑھیں گے
یہ سُنتے ہی تھرّانے لگے حضرتِ عباس
سر کھولے ہوئے بی بیاں ڈیوڑھی کے جو تھیں پاس
ٹوٹا ہے فلک بنتِ شہنشاہِ نجف پر

ہے ہے کا جو اک شور ہوا رانڈوں میں برپا
چلّائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا
ہے ہے نہ کرو صاحبو گھبرائیں گے شبیر
تم روتے ہو کس واسطے میں تو نہیں روتی
دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی
قایم رہے اقبال محمد کے خلف کا

سر اپنے نہ کھولو کہ مجھے آتا ہے وسواس
شبیر تو سر پر ہیں جو بیٹوں سے ہوئی یاس
اب خلد میں دادی کے قریں جائینگے دونوں
زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
اپنے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
کہدے مرے ماں جائے کا حق کس پہ نہیں ہے

سر پہ مرے دُنیا میں سلامت رہیں بھائی
کیا لُٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں
لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے

گھبرا کے اُٹھے خاک سے شبیر بصد یاس
سب نے کہا لو شہ کی بہن ہو گئی بے آس
زینب کو چلو لیکے بس اب ماتمی صف پر
زینب بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا
پھر کون ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر

دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی
دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ماتمی صف کا
اک شب کی دلھن گھر میں ہے اُس کا بھی نہیں پاس
اکبر مری اُمید ہے قاسم ہے مری آس
کیا بیٹے نہ رونے سے چلے آئیں گے دونوں

باتیں یہ کہیں سب سے پہ سنبھلا نہ دلِ زار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہونچے شہِ ابرار
کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
رُخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلّور سے بازو
پھکنا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ٹکڑے ہوا سینے میں دلِ سبطِ پیمبرؐ
چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آ کر
مشتاق تھے ہم سیّدِ ذی جاہ کو دیکھو
سُن کے یہ صدا غش سے جو چونکا وہ دلِ افگار
اکبر سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کے دلدار
ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کھائیو بھائی
یہ کہہ کے لگے ہچکیاں لینے جو وہ پیارے
سر پیٹ کے ہاتھوں سے یہ شبیر پکارے
پھر کی نہ کوئی بات سفر کر گئے دونوں
حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
زینب نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی
لو چاک گریباں کیئے آتے ہیں شبیرؑ
بیٹھی صفِ ماتم پہ ادھر شاہ کی خواہر
لاشوں کو لیئے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
فرمایا کہ لو لختِ جگر آئے تمھارے
تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
مہماں کوئی ساعت کے ملے وہ جگر افگار
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے
جُھک آئے تھے کٹ کٹ کے مہِ نو سے وہ ابرو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سہ پہلو
ہونٹوں پہ زباں نکل آئیں تھیں عطش سے
ہی ہی کہا اور لاشوں سے لپٹے شہِ صفدر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر
مرتے ہوئے دیدارِ شہنشاہ کو دیکھو
دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار
سر پیٹیں جو اماں انھیں سمجھائیو بھائی
بس موت کے آثار نمایاں ہوئے سارے
ماموں سے بچھڑتے ہو میں قربان تمھارے
آنسو تھے رواں آنکھوں سے اور مر گئے دونوں
رانڈوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
فضّہ یہ پکاری کہ دوہائی ہے دوہائی!
معصوموں کے لاشوں کو لیئے آتے ہیں شبیرؑ
سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھول دیئے سر
زینب کے قریں بیٹھ گئے سر کو جُھکا کر
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمھارے

شبیر نے جب دونوں کا زینب سے لیا نام ۔ ہر چند کیا ضبط پہ تھرا گیا اندام
دل تھام کے کہنے لگی وہ بیکس و ناکام ۔ آپ اُن سے رضا مند ہیں یا شاہِ خوش اندام
فرمایا دل اُن دونوں سے واللہ خوشی ہے ۔ میں اُن سے خوشی ہوں مرا اللہ خوشی ہے

عاشق تھے مرے اور مرے غمخوار تھے دونوں ۔ بچے تھے مگر صادق الاقرار تھے دونوں
اُس وقت میں ماموں کے مددگار تھے دونوں ۔ حیدر کی طرح صفدر و جرار تھے دونوں
موت آئے کہ داغوں سے دل اب بھر گیا زینب ۔ دونوں یہ نہیں مر گئے ہیں مر گیا زینب

افسوس کہ ان دونوں کی دیکھی نہ جوانی ۔ میں کیا کہوں کیا صاحبِ ہمت تھے یہ جانی
ہوتی ہے بہت زخمیوں کو تشنہ دہانی ۔ پر ہم سے دمِ مرگ بھی مانگا نہیں پانی
سمجھے کہ گرفتارِ ستم آج ہے ماموں ۔ وہ جانتے تھے پانی کو محتاج ہے ماموں

ہمشیر سے یہ کہہ کے جو روئے شہِ ابرار ۔ بس آگیا فرزندوں کی ہمت پہ اُسے پیار
تھرائی ہوئی خاک سے اُٹھی وہ دل افگار ۔ پاس آن کے لاشوں کی بلائیں لیں کئی بار
کانپے جو قدم گر کے سنبھلنے لگی زینب ۔ منہ خون بھرے چہروں سے ملنے لگی زینب

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی اُمنڈ آئی ۔ نزدیک تھا مرجائے یداللہ کی جائی
پر فاطمہ کے صبر کی شان اُس نے دکھائی ۔ سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی
بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا ۔ اے بیبیو صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

روکر شہِ والا نے کہا صدقے میں تم پر ۔ دم بھر انھیں رو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر
بانو نے اشارا کیا اے سبطِ پیمبر ۔ قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب ۔ یہ ماتمِ اولاد ہے مرجائیں گی زینبؑ

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ ۔ فرزندوں کو چلّانے لگی زینبِ ذی جاہ
یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ ۔ صدقے گئی جاؤ شہِ کونین کے ہمراہ
زخمی ہوئے شبیر تو جان اپنی میں دوں گی ۔ اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لو نیمچے کاندھوں پہ دھروا ای مرے پیارو
تنتے ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو
گو پیاسے ہو دو دن کے پہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اُتارو
اُٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

سوتا ہی لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
بچّو تمھیں کیا سن کے کہیں گے شہِ عادل
دیکھو کہ تڑپتی ہی یہ ماں صورتِ بسمل
سُلجھاؤ یہ زُلفیں کہ اُلجھتا ہی مرا دل
کیا غش ہیں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں ہوتا

پھر دونوں کے سر زانو پہ رکھ کر یہ پکاری
لو اب ہوا معلوم کہ تم مر گئے واری
بے ہوشی ہی کچھ مجھ کو خبر تھی نہ تمھاری
اب آنکھوں سے چھپ جائیں گی یہ صورتیں ساری
دُنیا کو نہ دیکھا کہ اجل آ گئی بچّو
ہی ہی یہ تمھیں کس کی نظر کھا گئی بچّو

بچّو تمھیں قسمت نے نہ پروان چڑھایا
حسرت رہی ماں نے تمھیں دولہ نہ بنایا
پیدا ہوئے جس دن سے کبھی چین نہ پایا
دیکھی نہ جوانی کہ پیامِ اجل آیا
ہی ہی چمنِ دہر میں پھولے نہ پھلے تم
جب فصلِ بہاری کے دن آئے تو چلے تم

میں روتی تھی در پر مجھے سمجھا نہ گئے تم
دروازے پہ دم بھر کے لیے آ نہ گئے تم
ہی ہی دولھنیں بھی مجھے دکھلا نہ گئے تم
پیاسے تھے مگر جانبِ دریا نہ گئے تم
جیتی ہی وہ ماں جس کے گزر جانے کے دن تھے
یہ بیاہ کی راتیں تھیں کہ مر جانے کے دن تھے

خاموش انیس اب کہ تڑپتا ہی دلِ زار
کافی ہی رُلانے کو تری درد کی گفتار
اس جنس کا گر آج نہیں کوئی خریدار
فیاض ہی لیکن شہِ مظلوم کی سرکار
افسردہ نہ ہو غنچۂ اُمید کھلے گا
کھل جائیں گی آنکھیں وہ صلہ تجھ کو ملے گا

مرثیہ (۹)

جاتی ہے کِس شکوہ سے رَن میں خدا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
حاضر ہیں صبح سے درِ دولت پہ جاں نثار
پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار
شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے

رُخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
جُھک جُھک کے چست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے
چہرے وہ سرخ سرخ وہ جرأت کے ولولے
مر کر بھی دل میں اُلفتِ حیدر کی بو رہے

حاضر ہے ذوالجناح شہنشاہِ بحر و بر
خادم چونر لیئے ہیں کھڑے اِدھر اُدھر
گھوڑے سمندِ سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں
ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہے یہ پکار
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا

کمر میں تیغ غا پہ باندھے ہے مشکلکشا کی فوج
جنّت کا رُخ کیئے ہے شہِ کربلا کی فوج
خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے
اِک سو ٹہل رہے ہیں رفیقانِ ذی وقار
بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار
ایک اک کی جانبِ درِ دولت نگاہ ہے

کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
چلّے سے جوڑتا ہے کوئی ناقہ کش خدنگ
تکتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے
ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

کلغی ہے یا کہ خوشۂ پروین قریبِ سر
پیچھے ہیں باد پائے عزیزانِ نامور
پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں
آتے ہیں اب حضور خبردار! ہوشیار!
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

یہ سُن کے شاد ہو گئی فوجِ حسینؑ سب
بولے حبیب ابنِ مظاہر کہ شکرِ رب
سر دے کے لے بہشت کی جس کو تلاش ہو

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں
بازوئے شاہِ دیں جسدِ مرتضےٰ کے جاں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں
اُلفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی
بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار
جیسے نبی کی فوج میں تھے شیرِ کردگار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے

باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلّح قریبِ شاہ
رُتبے کو اوج، نخلِ ترقی مراد پر
شیرِ خدا کا خودِ مبارک ہے زیبِ سر
مہتاب ہے کہ ابر سے نکلا ہوا قمر
ڈورے جو سُرخ سُرخ ہیں چشمِ سیاہ میں

اِس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایتِ رسول
قد سرو باغِ حسن نہ پستی فزوں نہ طول
یہ شور تھا نمک کا جہاں کے ورق میں

آئے رفیق سب درِ دولت پہ با ادب
ہاں سرفروشو جنگ و جدل کا مزا ہے اب
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کے لاش ہو

قابل اسی کے دوشِ مبارک کے ہے نشاں
پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علی میں ہیں
طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی
جرأت وہی جدال وہی دبدبا وہی
خود تھا علیؑ کا قول کہ عباسؑ شیر ہے

لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جاں نثار
شیرِ خدا کے بعد یہ حصّہ اسی کا ہے

خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ
ہیں سامنے علم لیے عباسِ عرش جاہ
گویا علی کھڑے ہیں مہیّا جہاد پر
کلغی ہُمائے اوجِ سعادت کے جس میں پر
ابرو ہیں ذوالفقارِ ید اللہِ نامور
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

رخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول
وہ لب کہ جس سے روح کو ہو تازگی حصول
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

دیتے تھے تہنیت جو عزیزانِ پُر جگر
فرطِ طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر
وہ آسمان حشم تو یہ کیواں جناب ہیں
زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار
ان کی طرف سے مہتممِ بند و بست ہیں

فرماتی تھیں یہ دخترِ خاتونِ کائنات
اُس وقت ہی خوشی جو اس آفت سے ہو نجات
گھیرا ہے بے گناہ شہِ مشرقین کو
سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذی جاہ میں مگر
نہ جانبِ عَلَم تھی نہ ماں کی طرف نظر
اس طرح تھا عرق رُخِ پُر آب و تاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر
ہٹ کر کیا اشارا کہ آؤ ذرا ادھر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے
ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اتار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پل
اب کیا ہوا یہ کونسا غصہ کا ہے محل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے ولولے ہیں

عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر
رخ کی ضیا ادھر تھی علم کی ضیا اُدھر
غل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

منصب مبارک اے شہ مرداں کے یادگار
مجھ کو سمجھیے عون و محمدؐ کا جاں نثار
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں
تم دونوں کے بزرگ ہو یہ کونسی ہے بات
سمجھوں کہ بیکسوں کو دوبارہ ملی حیات
تم سب شریک ہو کے بچا لو حسین کو

چیں بر جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر
سمجھیں عَلَم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر

قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اُداس تھے
تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
دولہا سے بن کے جاؤ امامِ اُمم کے پاس
سُرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل
آنکھوں میں اشک رُخ پہ عرق ابروؤں پہ بل
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
پروا ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال
ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہِ خوش خصال
کیا ورثہ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
پھوپھی سنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا
غبطہ نہ اس میں چاہیئے جو امرِ خیر ہو
اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال
پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
لو اپنے دودھ کی تمھیں دیتی ہوں میں قسم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
کہنے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
دیجے ہمیں سزا جو بل ابرو پہ پھر پڑیں

پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
اب مشورے ہیں اور تصوّر ہیں اور اور
اوروں کا ذکر کیا تمھیں میری خبر نہیں
ہوتا ہے آفتوں میں محبّت کا امتحاں
مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
غصّہ کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں
دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال
اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال
اِس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے
اب اُس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا
وارث وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو
تم ہوگے تا بہ عصر نہ عباسِ خوش خصال
مجھ کو نہیں یقین کہ بچے فاطمہ کا لال
رہ جاؤں گی ہیں قیہ ہیں جانے کے واسطے
اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
دو جا کے اُن کو تہنیتِ عہدۂ علَم
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال
ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
کہیئے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

زینبؑ بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
دے ایسے بیٹے سب کو زمانے میں کردگار
لازم خوشی ہی جو جسے عہدہ سپرد ہو

پہنائے پیار سے اُنھیں پھر فاخرہ لباس
جب اُن کو لیکے آئیں امامِ اُمم کے پاس
دو چاند ہیں یہ خانۂ شبیرِ الٰہ میں

نکلے نہیں ہیں گھر سے ابھی تک یہ گلبدن
فوجوں سے گونجتا ہی یہ سب کربلا کا بن
لشکر سے تیرِ کیں مری جانب جو آئیں گے

بنتِ علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر
اِک جان ہی بس اور یہ دو پارۂ جگر
پالا ہو جس نے اُس کا نہ کچھ حق ادا کروں

پھر عرض کی کہ ای خلفِ شاہِ قلعہ گیر
دونوں نے بنتِ شیرِ خدا کا پیا ہی شیر
تلواریں چمکیں خون کے دریا چڑھے رہیں

حضرت کے آگے بات کی ان کو نہیں مجال
دادا کا رُعب و دبدبہ و شوکت و جلال
کیجے نظر سنوں پہ تو بے شک صغیر ہیں

روتی تھیں جو آج کی شب کو بدرد و یاس
آکر کہا کہ آپ کو اتنا ہی کیوں ہراس
کل شیر سب ہیں اور یہ دشتِ مصاف ہی

دونو ہو تم سعید و رشید و وفا شعار
ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم و ذی وقار
چھوٹوں کے تم بزرگ بزرگوں کے خورد ہو

ہتھیار جب لگائے تو روئیں بدرد و یاس
بولے گلے لگا کے اُنھیں شاہِ حق شناس
زینب اُنھیں بھی بھیجوگی کیا قتل گاہ میں

تلوار اگر چلی تو پڑے گا غضب کا رن
طالب ہیں ایک جان کے دو لاکھ تیغ زن
میں کس طرح جیوں گا جو یہ زخم کھائیں گے

رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہِ بحر و بر
مایہ مری یہی ہی یہی دولت یہی ہی زر
ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

اس کا نہ کیجے دھیان کہ یہ سن میں ہیں صغیر
سینہ سپر کریں گے یہ جس دم چلیں گے تیر
اُمید ہی کہ سب سے یہ آگے بڑھے رہیں

مخفی حضور پر ہی ارادوں کا ان کے حال
تیغ و سپر میں ہی شہِ مرداں کی چال ڈھال
ہمت میں نوجوان ہیں متانت میں پیر ہیں

دونوں دلا سا دینے کو آ بیٹھے میرے پاس
آسان کچھ ہی قتلِ شہنشاہِ حق شناس
سُن لیجیے گا آپ کہ میدان صاف ہی

حضرت کے ساتھ فضلِ خدا سے ہیں وہ دلیر
تا کوفہ کیا عجب ہے جو ہوں زخمیوں کے ڈھیر
بچّے ہیں شیر کے جنھیں بچّہ سمجھتی ہیں
بیکا ہو دشمنوں کا شہِ دیں کے بال اگر
حضرت تک آ سکے کوئی کیا جان کیا جگر
پوتے شجاع کے ہیں نواسے دلیر کے

لاکھوں ہیں وہ جواں نہیں اس آن بان کے
حملے کریں گے رن میں جو سینوں کو تان کے
سوسو کی جان لیں گے ہر اک جان کھوئے گا
خالی نہ جائیں گے یہ شجاعت کے ولولے
ہم بھی ہیں بنتِ فاطمہ کے شیر کے پلے
چمکا کے پنجوں کو جو کھیلیں گے جان پر

دونوں نے اس طرح بہ فصاحت کیا بیاں
گویا دوبارہ آ گئی میرے بدن میں جاں
محسن ہو آج جو میرے بھائی کی پچ کرے
ہر بار دیکھتی ہوں ہیں ان کی طرف بغور
کہتے ہیں ناگوار ہیں اعدا کے ظلم و جور
سکّہ پڑھے حسین علیہ السّلام کا

نو دس برس کے ہیں ابھی بچّوں کے کیا ہیں سن
یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب حُسن
گھوڑے اُڑا اُڑا کے جو فوجوں پہ جائیں گے
تھرّا کے بھاگ جاتا ہے نعروں سے جن کے شیر
کر دیں گے رستموں کو زبردستیوں سے زیر
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

پھر کاٹ ڈالیئے گا تنوں سے ہمارے سر
آنکھیں نکال لیں جو کرے غیظ سے نظر
ساعد ہیں یہ علی کے یہ بازو ہیں شیر کے
حافظ ہیں سب یہ مصحفِ ناطق کی جان کے
مل جائیں گے زمیں سے طبق آسمان کے
ہم سب کے بعد ہوگا جو قسمت میں ہوئے گا

رکھ دینگے دوڑ دوڑ کے تیغوں پہ خود گلے
مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے
لاشے زمیں پہ ہوں گے لہو آسمان پر
مجھ کو یقینِ فتح ہوا یا شہِ زماں
خوش ہو کے بولی میں کہ تصدّق ہو تم پہ ماں
اس منہ کے میں نثار خدا اس کو سچ کرے

دو تین دن سے اور ہیں کچھ تیوروں کے طور
جب چین ہو مٹے جو یزیدِ لعیں کا دور
خطبہ ہو منبروں پہ شہیدوں کے نام کا
راتیں یہ غفلتوں کی ہیں اور کھیلنے کے دن
لیکن کبھی نہ ان کی طرف سے ہوئی مطمئن
اتنا ہی جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئیں گے

پھر وہ حسین جو چھوٹے کی باتیں سنیں حضور
نامرد ہو جو آج کرے جنگ میں قصور
بس چند روز رہ چکے دنیائے زشت میں
ہر بار الٹ کے کرتے کی ننھی سی آستیں
ہیں مرتضےٰ علی کے پسر شیرِ خشمگیں
کل ننھے ہیں اور عدو کی سپاہ ہے
ہنس ہنس کے مجھ سے کرتے تھے دونوں ابھی بیاں
میں نے کہا قوی ہوئے کچھ دستِ ناتواں
اب تو غلام قبلۂ عالم کے ساتھ ہیں
فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا
اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دل ربا
تم کس طرح جیو گی جو دونوں سے یاس ہو
زینب نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو
بچ جائے جان آپ کی یا شاہِ نیکخو
بہتر ہے دونوں بیٹوں کی گر سوگوار ہوں
طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جدا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا
تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
دم بھر مفارقت ہو تو آنسو بہاتے ہیں
دونوں جب ایک جا ہوں تو کھانے کو کھاتے ہیں
بھائی جو زخمِ نیزہ و شمشیر کھائے گا

کہتا ہے ننھے کو ہلا کر وہ ذی شعور
اس کو نہ قصرِ خلد ملے اور نہ وصلِ حور
کل پہلے داخلہ ہے ہمارا بہشت میں
کہتا ہے کیا لڑیں گے دلیروں سے اہلِ کیں
جانیں ہزار ہوں تو نثارِ امامِ دیں
روتی ہیں والدہ ہمیں دنیا سیاہ ہے
ہم کو حضور نے نہ دیا فوج کا نشاں
بولے کہ خیر آئے تو ہوگا یہ امتحاں
کوفے کا ڈر ہے اور یہ کمزور ہاتھ ہیں
ہیں ورثہ دارِ شیرِ الٰہی یہ باوفا
زینب تمہارے پاس رہے ایک مہ لقا
گھر لٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو
دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو
میں طالبِ ثواب یہ خواہانِ آبرو
میں بھی جنابِ فاطمہ کی ورثہ دار ہوں
کھیلے تو ایک گھر میں پلے ہیں تو ایک جا
بیشک ہیں ایک جان دو قالب یہ مہ لقا
وہ کس طرح جیئے گا جدا ہو کے بھائی سے
روتے ہیں اس طرح کہ مجھے بھی رلاتے ہیں
مکتب میں ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ آتے ہیں
انصاف آپ کیجیے یہ مر نہ جائے گا

چھوٹا تنک مزاج ہے یا شاہِ بحر و بر
نو دس برس جہان میں ہوئے جس طرح بسر
ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہِ نامدار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار
اِن پر ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپ کا

کرتے تھے مجھ سے وقتِ سفر رو کے یہ بیاں
بچوں کا ساتھ اور سفر خوف الاماں
وقت آ پڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہِ خاص و عام
مٹتی ہے نسلِ جعفرِ طیارؓ نیک نام
لِللہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے

چُپ ہو گئے بہن سے بہت خوب کہہ کے شاہ
بڑھ آئی ہے اُدھر سے بہت شام کی سپاہ
حملوں سے فوجِ شام کے جی چھوٹ جائیں گے

زینب کے نورِ عین بڑھے جب بصد حشم
ماں کا اشارہ تھا کہ زہے شفقت و کرم
کچھ حد ہے اس بزرگی و جاہ و جلال کی

لیکر بلائیں بھائی کی بولی وہ سوگوار
پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار
صدمے سے جان انہیں نہ ہرا کی جاتی ہیں

سُن لے تو جان دیدے گلا اپنا کاٹ کر
باہم یوہیں جہان سے کریں آخری سفر
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

کرتا قدم پہ سر کو تصدق یہ افتخار
میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جانِ زار
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

محروم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں
مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہِ زماں
بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کیجیو

تم کو جہاں میں پھر نہ ملیں گے یہ تشنہ کام
چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام
ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجیے

قاسم نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ دیں پناہ
فرمایا آپ نے کہ نگہبان ہے اِلٰہ
جب ہم بڑھے تو مورچے سب ٹوٹ جائیں گے

کھولا سروں پہ حضرتِ عباس نے علم
ہاتھوں کو جوڑ جلد جھکو چومنے قدم
دیکھیں نوازشیں شہِ مرداں کے لال کی

اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ میں نثار
ان کی مدد ضرور ہے ہنگامِ کارزار
دھڑکا یہ ہے کہ دیکھیے کیا ہو لڑائی میں

سیراب اُدھر ہیں سب اُنھیں سولہ پہر کی پیاس
پستی پہ جب ہو شیر تو بیجا ہی پھر ہراس
کیا ہو جو نہر دیکھ کے ہو جائیں بے حواس
رہنا نہ دور ان سے اگر ہی بہن کا پاس
بچّے کہاں یہ اور وہ دَل فوجِ شام کا
بھیّا مجھے ہی دھیان بزرگوں کے نام کا

زندوں میں آویں جو یہ مقتل سے مر کے آئیں
کنبے میں سرخرو ہوں اگر خوں میں بھر کے آئیں
اُلٹیں بہادروں کی صفیں نام کر کے آئیں
خیمے میں آئیں اب تو جہاں سے گزر کے آئیں
بھیّا مجھے قسم ہی جنابِ امیر کی
پانی پیا تو بوند نہ بخشوں گی شیر کی

عبّاس نے کہا یہ نہ فرمائیے حضور
ایسے یہ شیر ہیں کہ کریں جنگ میں قصور
بچّے کسی نے دیکھے ہیں اس طرح کے غیور
کوفے کو شام پر جو اُلٹ دیں تو کیا ہی دور
بچپن میں کافروں سے خدا کے ولی لڑے
یہ یوں لڑیں گے جیسے اُحد میں علی لڑے

مثلِ علی وغا میں کریں گے یہ جدّ و کد
ہی سب عرب میں لیث سے غالب اُنھیں کا جد
غل ہو گا گونجتے ہیں ترائی میں دو اسد
جس دم رجز پڑھینگے یہ صفدر بشدّ و مد
سب خصلتیں ہیں شیر کی بچے ہیں شیر کے
یہ پارۂ جگر ہیں علی سے دلیر کے

کچھ فکر کی جگہ نہ تردد کا ہی مقام
سُن لیجیے گا آج یہ جیسے کرینگے کام
ان سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
میں عبدِ سرفروش ہوں ای خواہرِ امام
بندے کا حفظ خالقِ عالم کے ہاتھ ہی
روتی ہیں آپ کیوں مری جاں ان کے ساتھ ہی

یہ سُن کے مضطرب جو پھری وہ جگر فگار
دیکھا بڑھے ہیں جانبِ در شاہِ نامدار
پھیلا کے ہاتھ کہنے لگے شاہِ ذی وقار
زینب گلے سے بھائی کے لپٹو پھر ایک بار
جو حالِ دل ہی کہہ نہیں سکتا زباں سے میں
چھٹتی نہیں تم آج بچھڑتا ہوں ماں سے میں

بھائی بہن کے درد کی باتیں لکھوں اگر
بہہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
چھاتی سے سر لگائے ہوئے تھی وہ نوحہ گر
رکھے ہوئے تھے دوش پہ سر شاہِ بحر و بر
غم سے جگر لہو تھا شہِ مشرقین کا
سیدانیوں میں شور تھا ہی ہی حسین کا

بنتِ علی کے پیچھے تھی سیدانیوں کی صف
لڑیاں تھیں چار ایک سی اشکوں کی دوطرف

غربت میں اور کوئی نہ یاور نہ عون ہے
فرما کے یہ بڑھا پسرِ ختمِ مرسلیں
مشکل تھا ضبط غش ہوئی وہ بیکس و حزیں
دامن علم کا کھول کے عباس رُک گئے
دیکھا جو نورِ چہرۂ سردارِ خاص و عام
سر کو جھکا جھکا کے جھکے جب پئے سلام

یعنی غلام منکسر و خاکسار ہیں
سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
روح امیں نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
نورِ محمدی رُخِ انور کی ضو میں ہے
اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
بہرِ جہاد در راہِ خدا مطمئن چڑھے

سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارا بصد حشم
برہنہ کمان کیانی تھی دوش پر
ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار
آنکھوں سے شبرِ نر کے جلالت تھی آشکار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
غل تھا مدد کو آئیے اب یا شہِ نجف
شہ کہتے تھے بہن نہ کرو جان کو تلف

تم مر گئیں تو پھر مرے بچوں کا کون ہے
ماتم کی صف پہ بیبیاں زینب کو لے گئیں
خیمے سے نکلے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
صف باندھ کر سلام کو مجرائی جھک گئے
پڑھنے لگے دُرود جوانانِ تشنہ کام
جو سر تھا سر جھکانے میں وہ پا گئے امام

اس پائے عرش قدر پہ یہ سر نثار ہیں
بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
بسم اللہ ای خدیوِ زماں مالکِ رقاب
شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے حسن چڑھے

پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں
گردن میں کچھ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
یعنی جہاں سے جائیں گے سیدھے جناں میں ہم
قبضے پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر
رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار

رعشہ وداع ہو گیا ہاتوں کو چوم کے

اِک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے — پائی دُعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے — پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا — یوں جھرّیاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار — یہ کس لئے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اُتر پڑوں گا نہ ہو گے اگر سوار — کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم — ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

فرمایا تم کو دیتا ہوں اُس سر کی میں قسم — جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم
میں بھی نکالتا ہوں رکاب سے اب قدم — اچھا تمھارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پہونچو جناں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے — ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے

وہ لوٹنا بھی خاک کا اب تک ہے یادگار — تم پر بھی گرد تھی مری زلفوں پہ بھی غبار
اُس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار — فرماتے تھے یہ ہے مرے پیارے کا دوستدار
شبیر کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں — لوٹے گا یہ لہو میں یہ نہیں جانتا ہوں میں

رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دَور — اب اُن کا دَور ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جور
یہ وقت اور کچھ ہے وہ ہنگام تھا کچھ اور — مولا کبھی رہا نہیں دُنیا کا ایک طور
گردش نئی فلک کی نئے انقلاب ہیں — کوثر ہے جن کا آج وہ محتاجِ آب ہیں

یہ عرض کر کے روئے حبیبِ وفا شعار — جھُک کر کہا یہ پیر غلام آپ پر نثار
جب تک سمند پر وہ دلاور ہوا سوار — روکے رہے لگامِ فرس شاہِ نامدار
ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے — کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے

بس چھیڑ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے — آگے جو تھے رُکے ہوئے وہ سب جواں بڑھے
کاندھوں پہ رکھ کے نیزوں کو شیرِ ژیاں بڑھے — مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے
یوں طے کیا دلیروں نے اُس راہِ خیر کو — جاتا ہے جس طرح کوئی گلشن میں سیر کو

بشاش قتل گاہ میں پہونچے جو وہ دلیر
دعویٰ یہ تھا کہ کیجیو اِن سرکشوں کو زیر
تیغوں سے روم و شام کی بستی اُجاڑ دیں

حد سے سوا تھی کثرتِ فوجِ ستم شعار
پیدل تھے بے حساب تو تھے لاتعد سوار
پیکِ خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے

اکناف بحر و بر میں جو لشکر کا تھا مقام
ناکوں پہ چوکیاں تھیں جزیروں میں اہتمام
آیا کبوتر اُڑ کے جدھر صید ہو گیا

ظاہر ہوئی سیاہیِ لشکر سے دن کو رات
دُنیا پرست دُشمنِ ساداتِ نیک ذات
دریا کے صرفِ آب سے لب خشک ہو گئے

دُنیا میں نیک کم ہیں بہت اور بد ہزار
چالیس کل پیادے تھے بتیس سب سوار
بوڑھے سے قد تھے ایک بھی اُن میں جواں نہ تھا

بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح
چاہیں لبوں کو اُن کے جو باتیں سنیں فصیح
جد و پدر کی طرح جری تھے دلیر سے

وہ نیمچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں یہ بانوں کو اس کا ذوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں

نیزوں کو گاڑ گاڑ کے گونجے مثالِ شیر
عرصہ یہ جنگ میں ہو نہ فتح و ظفر میں دیر
کوفے کے در پہ جا کے نشانوں کو گاڑ دیں

لکھی ہے راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار
فوجوں کا دستِ چپ کی بھی ممکن نہیں شمار
پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے

شہر و جبل بھرے ہوئے تھے فوج سے تمام
مسدود ہو گئی تھی سبیلِ خط و پیام
قاصد جہاں ملا وہ وہیں قید ہو گیا

وہ کشمکش کہ موت کے طالب تھے ذی حیات
مقتل سے کوفے تک ہے قشون[۱] زبوں صفات
جتنے کنوئیں تھے راہ میں سب خشک ہو گئے

لکھا ہے فوجِ شہ کا کتابوں میں یہ شمار
طفل اُن میں تھے کئی سمن اندام و گلعذار
سبزہ بھی جن کے گورے رُخوں پر عیاں نہ تھا

شیریں سخن لبوں میں نمک رنگتیں ملیح
مُردوں کو دم میں زندہ کریں صورتِ مسیح
بچے تھے یوں پہ غیض جو آئے تو شیر تھے

جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق
گیسو رُخوں پہ کانوں میں بُندے گلوں میں طوق
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

۱؎ ترکی لفظ [illegible] لشکر [illegible] ۱۲

ایک ایک خوش بیاں تو ہر اک نکتہ سنج ہے
لشکر وہ ہے کہ حسن کے دریا کا گنج ہے
انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے
کم گو کوئی حسین کوئی شیریں سخن کوئی
نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی
دولت یہی حسین کے حصّہ میں آئی تھی
شیرانِ دشت کو جگر ایسے نہیں ملے
حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے
جو تھا نبی کے بعد خدا کے ولی کا تھا
پہلے پہل جو نکلے تھے گھر سے وہ گلعذار
فرماتے تھے یہ روک کے عباسِ نامدار
حجت تمام کی نہیں شاہِ غیور نے
عجلت کو جانتے ہیں سبک جو ہیں ذی وقار
دیکھو تماشہ فوج کی کثرت ہے بے شمار
جلدی نہ کیجو گو کہ لڑائی میں دیر ہو
دستِ ادب کو جوڑ کے بولے وہ تشنہ کام
بیٹے سے مسکرا کے یہ کہنے لگے امام
بیٹا یہ سن میں چھوٹے ہیں سب میں بڑے ہو تم
بپھرے ہوئے ہیں شیر خبردار ہوشیار
عجلت ہر ایک امر میں بچوں کا ہے شعار
جان اپنی سب دیئے ہیں بزرگوں کے نام پر

کچھ پیاس کا نہ غم ہے نہ فاقوں کا رنج ہے
چہرہ ہر اک کا ماہ چہار و دو پنج ہے
کہتا ہے حسن خود کہ نثار ان کی شان کے
بچپن میں سرو قد کوئی رشکِ چمن کوئی
تصویرِ جد کوئی تو شبیہِ حسن کوئی
مایہ تھی فاطمہ کا علی کی کمائی تھی
غوّاص کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے
جعفر نے پائے بال و پر ایسے نہیں ملے
حضرت کو وہ ملا کہ جو حصّہ علی کا تھا
تیغیں چمکتی دیکھ کے بڑھتے تھے بار بار
شیرو ابھی نہیں ہے تمھیں حکمِ کارزار
سبقت نہ کرنا۔ منع کیا ہے حضور نے
بے وقت دوڑتے نہیں ذی قدر و ذی وقار
باجے بجا کے کھولینگے رایت ستم شعار
تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو
کہہ دیجئے ہمیں علی اکبر کے یہ پیام
عاشق تمھارے نام کے ہیں یہ فلک مقام
اچھا صف ان کی باندھ کے آگے کھڑے ہو تم
کوئی بڑھانے پائے نہ اس صف سے راہوار
بہلا کے روکے رہنا انھیں تم پہ میں نثار
گھوڑے اڑا کے جا نہ پڑیں فوجِ شام پر

تسلیم کر کے شہ کو مرتب جو کی وہ صف
فرقت میں جن کی چاک رہا سینۂ صدف
اُن سے کسے جہان میں عشقِ ولی نہیں
شرمندہ جس سے چاند ہو چہرے وہ تابناک
خود وادی السلام جو چھانے نجف کی خاک
تسبیح ہاتھ آئے یہ کس نیک نام کو

شبیرِ خدا کے ساتھ جگر بندِ نامدار
پوتے چھیوں وحیدِ زماں فخرِ روزگار
خود جس کی فرع و اصل علی و بتول تھے
یوسف تھے ایک مصر میں اور مشتری ہزار
یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گلعذار
یاں منزلت بھی قدر بھی قیمت بھی فوت تھی

تیغ و ترنج اگر ہوں ہلال اور آفتاب
گر دیکھ لیں وہ حسنِ ملیح اور وہ شباب
پریاں تو اُن کے سایہ کا پیچھا نہ چھوڑتیں
لاریب فیہ حسن میں یوسف تھے بے مثال
مثلِ نبی ملیح تھے یہ سب نکو خصال
شور آج تک ہے خوبیِ یوسف میں شک نہیں

سب اُس پرے میں تھے گہر قلزم شرف
زہرا کے رشتہ دار ید اللہ کے خلف
اب تک وہ آبرو تو کسی کو ملی نہیں
دل بلبلوں کے خون تو گریباں گلوں کے چاک
ایسے کبھی ملیں نہ گہر ہائے صاف و پاک
دُرِّ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو

دونوں نواسے حضرتِ زہرا کے یادگار
یکتائے دہر پانچ بھتیجے فلک وقار
یہ سب اسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے
کیف و کمِ ثمن ہے کتابوں سے آشکار
عالم کی جان فخرِ حسینانِ روزگار
زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی

سرکائے چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب
حوریں گلوں کو کاٹ کے رہ جائیں نہ تاب
دامن کبھی جنابِ زلیخا نہ چھوڑتیں
گستاخیاں معاف ادب کا بھی ہے خیال
وہ چاشنی سخن کی وہ شیرینیِ مقال
پھیکا ہے پر وہ حسن کہ جس میں نمک نہیں

ناگہ نشاں بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے
رفعت بڑھی زہے سعادت سرشت کی
کھولا اِدھر علم کو علمدارِ شاہ نے
طوبیٰ لکم کہا شہِ عالم پناہ نے
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکرِ سادات کا نشاں
پنجہ مثالِ پنجۂ خورشید زر فشاں
مشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
نقارۂ وغا پہ لگی چوب ناگہاں
شہپور کے غریو سے ہلتا تھا آسماں
نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
شہنا کا شور سُن کے لرزتا تھا بند بند
صحرائے ہولناک کی وحشت ہوئی دوچند
سُن کر دہل کا شور سب کے کلیجے دہل گئے
پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار
نکلے وغا کو قبلۂ عالم کے جاں نثار
ہونگی نہ ہیں نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے
حُرو بریر و وہب و عمیرِ فلک مقام
سعد و زہیر قین و حبیبِ خجستہ کام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
نکلے وغا کو ایلچیِ شاہ کے پسر
فوجوں پہ حملہ ور ہوئے حسین وہ شیر نر
رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اُتار کے
لاشوں کو قتل گاہ سے لے آئے جب حسینؑ
کی عرض یا امامِ زماں شاہِ مشرقین
پھر وقت کونسا ہی جو اب ہم فدا نہ ہوں

دامانِ پاک کشتیِ اُمت کا بادباں
پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا
گردونِ دوں سے پار ہوئی طبل کی فغاں
قرنا کی وہ مہیب صدا اٹھی کہ الاماں
گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا
برچھی ہلی رسالوں میں نیزے ہوئے بلند
ڈر کر کنوتیوں کو بدلنے لگے سمند
صحرا سے دب کے شیرِ نیستاں نکل گئے
مولا نے غازیوں کو دیا حکمِ کارزار
جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار
سب جاں نثار حقِ نمک سے ادا ہوئے
وہ مسلم ابن عوسجۂ عرش احتشام
وہ شیر جس کا بو عمرِ نہشلی تھا نام
ایک ایک مرتے مرتے ہزاروں کو اُلٹ گیا
ماتم میں تھے کہ تھا ابھی تازہ غمِ پدر
دم میں تنوں سے کٹ کے گرے کوفیوں کے سر
مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے
نکلے پرے سے حضرتِ زینب کے نورِ عین
رانڈوں میں ہے یتیموں کے ماتم کا شور و شین
دل تھرتھرا رہے ہیں کہ اماں خفا نہ ہوں

فرمایا کیا نہ جاؤ گے رخصت کو ماں کے پاس
دونوں نے ہاتھ جوڑ کے تب کی یہ التماس
اکبر سے آپ پوچھ لیں یا شاہِ حق شناس
فرما رہی ہیں والدۂ آسماں اساس
اب گھر میں آئیو تو وغا کر کے آئیو
سر لیکے ابنِ سعد کا یا مر کے آئیو

فرمایا خیر فوج سے جنگ و جدال کرو
جو ماں نے کہہ دیا ہے اُسی پر عمل کرو
ہاں خواہشِ وصالِ عروسِ اجل کرو
بچپن میں اس بقا کو فنا سے بدل کرو
راحت نے اس طرف نہ کیا رخ نہ چین نے
دیکھے نہ ماں نے بیاہ نہ سہرے حسین نے

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے
یوں اشہبوں پہ دلبرِ ضرغامِ دیں چڑھے
نظروں سے سب اُتر گئے گھوڑے زمیں چڑھے
پریاں نکل کے قاف کی راہوں سے چھپ گئیں
دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہونچے جو رن میں برجِ شرف کے وہ آفتاب
نیزے زمیں پہ گاڑ دیئے مثلِ بوتراب
نعرہ کیا کہ او پسرِ سعدِ بے حجاب
ہمراہ لیکے شمر کو آسامنے شتاب
گو سیکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں
تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سنا ہے یہ کہ قریشی نسب ہی تو
نیکوں میں بد ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو
ہم تو کہتے ہیں او سگِ ناپاک کینہ جو
شیروں سے آ وغا کو جو ہے پاس آبرو
فاقوں میں زور دیکھ جدال و قتال دیکھ
دعویٰ ہے کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنتِ فاطمہ ہیں بنی فاطمہ ہیں ہم
دادا ہیں ابنِ عمِّ رسولِ فلک حشم
ہیں اس طرح حسب میں نبی و علی بہم
دو نام کو ہیں ایک ہیں پر کعبۂ و حرم
بھائی جدا ہے خویش جدا ہے وصی جدا
اُن سے علی جدا نہ خدا سے نبی جدا

بے فصل ہے وصیِ نبی مالک الرقاب
ضرغامِ دین مدینۂ علمِ نبی کا باب
دریائے فیضِ رحمتِ معبود کا سحاب
نورِ خدا سپہرِ جلالت کا آفتاب
جو اُن سے منحرف ہوا وہ دوزخی ہوا
ایسا کوئی شجاع نہ ایسا سخی ہوا

کہف الوریٰ سراجِ ہدیٰ حجتِ خدا
ہر ضرب جس کے ہاتھ کی تھی ضربتِ خدا
حق ساتھ ہے حسینؑ کے ہم اُن کے ساتھ ہیں
چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیے بس اب حضور
ہوتا ہے اور دھوپ سے اب پیاس کا وفور
دو ہاتھ ہیں بھگا کے سواروں کو گھاٹ کے
کھینچے یہ کہہ کے نیمچے دونوں نے یک بیک
گاوِ زمیں ادھر تھی ہراساں اُدھر سمک
غل تھا چمک دمک وہی سب آشکار ہے
دو بجلیاں سیاہ میں کوندیں فرس بڑھے
اب کون روکے شبر بڑھے جب تو بس بڑھے
بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا
وہ دونوا شہبوں کی روارو ادھر اُدھر
تابندہ تھے جو آٹھ مہِ نو ادھر اُدھر
کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے
آئے جدھر خدا کا غضب آ گیا اُدھر
جھپٹے جدھر شکست عدو کھا گیا اُدھر
انساں تو کیا کہ شیروں کے زہرے بھی آب تھے
کیا دونوں تازیوں کی سبک تازیاں لکھوں
کس طرح نیمچوں کی سرافرازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں

جس سے فزوں کسی نے نہ کی طاعتِ خدا
خاکی بنا وہ آئینۂ قدرتِ خدا
پہنچا علی کا زور جنھیں یہ وہ ہاتھ ہیں
مخفی ہوا ہے خیمے میں ڈر کر وہ بے شعور
مرنا ہے ہر طرح یہ تامل ہے کیا ضرور
خیمہ گرا دو اس پہ طنابوں کو کاٹ کے
پہونچی زمیں سے آئنۂ مہر تک چمک
ڈر کر پروں پہ نادِ علی پڑھتے تھے ملک
اک جا ہیں دو یہ نیمچے یا ذوالفقار ہے
جس طرح قافلہ سے صدائے جرس بڑھے
مقتل میں بیس ہو کے گرے جو کہ دس بڑھے
سب نے تگ و دو ڈھنگ ضربِ علی کا دکھا دیا
کاوے دیئے بس کے مر گئے سو سو ادھر اُدھر
پھیلی ہوئی زمیں پہ تھی صفو ادھر اُدھر
پریاں تھیں وہ کہ پھر رہی تھیں جھوم جھوم کے
پلٹے جدھر یہ رعبِ علی چھا گیا اُدھر
ٹھہرے جہاں کسی سے نہ دیکھا گیا اُدھر
آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب تھے
کیونکر رواروی میں خوش اندازیاں لکھوں
کیا دونوں شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
اعلیٰ یہ طرح ہے کہ نواسے علی کے ہیں

جو شیرِ حق میں تھی وہ شجاعت انھیں میں ہے
شبیرؑ سے کریم کی ہمت انھیں میں ہے
گو ان کے مدح خوانوں کے لب پہ سوال ہیں
وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شان
دینداریوں کا نور خدا دانیوں کی شان
باہم چلے نہ زور گیا کچھ نہ کس گیا
جس صف پہ زور سے وہ جلالت قریں بڑھے
وہ کیا بڑھے کہ دو اسدِ خشمگیں بڑھے
زندہ بھی کشتۂ خطر و بیم ہو گئے
چلّہ سے جس کا تیر ملا تن پہ سر نہ تھا
زندہ جو بھاگے چین اُدھر تھا ادھر نہ تھا
دریا تھا یا سپاہ صفیں تھیں کہ موج تھی
نیزوں میں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے
زندوں کے خوفِ جاں سے کلیجے دھڑک گئے
یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اُکھڑ گئے
وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
وہ پیچوں میں تیغِ علی کی صفائیاں
جس غول پر وہ صاحبِ شمشیر آپڑے
جس پہلوان پہ عون کی تلوار پڑ گئی
چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی
آنکھوں کو روکے صف سے وہ مردک نکل گیا

جعفر کی شان و شوکت و صولت انھیں میں ہے
کونین بخش دیں یہ سخاوت انھیں میں ہے
مُنہ بھر دیں موتیوں سے کہ زینب کے لال ہیں
وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں کی شان
وہ دونوں نیمچوں کی سر افشانیوں کی شان
جب چمکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا
غل پڑ گیا کہ دلبرِ ضرغامِ دیں بڑھے
شیروں کا وہ شکار ہوئے جو لعیں بڑھے
دو حصّے ہو گئے موت کے تقسیم ہو گئے
جُز گوشۂ فرار کسی جا مفر نہ تھا
کشتوں کے پشتے تھے کہ نظر کا گزر نہ تھا
دو بجلیوں کے بیچ میں اعدا کی فوج تھی
شیروں کی بو جو آ گئی گھوڑے بھڑک گئے
زخموں سے کیا مزا تھا کہ بسمل پھڑک گئے
ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اُٹھ گئے
وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ ولولے وہ پہلے پہل کی لڑائیاں
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آ پڑے
چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی
سرِ تیز اک سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی
گویا قضا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے
یہ گھاٹ قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے
بڑھتا تھا آپ سے نہ کوئی جنگ کے لیئے
جس پر اُڑا کے رخش وہ جانباز جا پڑا
دو ہو کے تیغ پر وہ فسوں ساز جا پڑا
دونوں ہیں نورِ عین علی سے غیور کے

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے
جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے
گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
ماتھے وہ اور وہ پیچ عمامہ کے لٹ پٹے
وہ ابروؤں کے بل کہ ہلالِ فلک کٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب و تاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ
لعل و گہر ہیں اُن درِ دنداں کے آگے دنگ
تشبیہ بھی جو اُن سے ندی نا اُمید ہیں
گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق
وہ نیچے وہ ہاتھ دلِ کفر جس سے شق
خالی ہیں گو شکم پہ یہ جرّار سیر ہیں

اُن دونوں اشہبوں کی وہ چھل بل وہ تنگ جائے
صوّت کا نہ پتا نہ وہ سرعت کا ڈھنگ جائے
پریاں تھیں وہ وہ اسپِ سعادت اثر نہ تھے

آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے
چھوٹے سے نیمچوں کی صفائی غضب کی ہے
لاتی تھی موت گھیر کے چو رنگ کے لیئے
ثابت ہوا کہ صید پہ شہباز جا پڑا
خود منہ کے بل سمندِ سبکتاز جا پڑا
آنکھیں نکال لیں کوئی دیکھے جو گھور کے

پہونچا سروں پہ تیغ کا سایہ جدھر بڑھے
گھونگٹ سپاہِ شام نے کھایا جدھر بڑھے
گویا چڑھے تھے دو نیے دولھا جہاد پر
گیسو جو بنتِ فاطمہؑ نے ہاتھ سے بٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جس سے نظر ہٹے
رُخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

وہ بھینی بھینی بو کسی غنچہ میں وہ نہ رنگ
اک منجمد وہ قطرۂ نیساں ہے اور یہ سنگ
اس غم سے موتیوں کے کلیجوں میں چھید ہیں
سُرخی نہیں یہ مہرِ منوّر پہ ہے شفق
سینے میں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق
فاقہ تو ارث ہے کہ یہ شیروں کے شیر ہیں

جو اُن کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
اُڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
سب تھی ہما کی تیز پری اور پرند تھے

اسوار آفتاب تو گھوڑے تھے ماہ رو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
دونو کنوتیاں کہ دو پیکانِ تیر ہیں
آنکھوں پہ کہیے جو نظر بے نظیر ہیں
سُرعت میں اُن سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
آئے اُدھر سے گر تو اِدھر سے نکل گئے
مانند برق لشکرِ شر سے نکل گئے
یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ اُن کے گوش
سرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش
پریاں اُڑا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
وہ سم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترک تاز
زیور تھا ایک شب کی دُلھن کا کہ اُن کے ساز
بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے ہیں
گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تا رکاب
یوں مرکبوں کے باندھے تھے سر وہ فلک جناب
غل تھا ہٹے رہو کہ مزاج ان کا آگ ہے
گھوڑوں نے کس بھرے ہیں قیامت بپا نہ کی
وہ کونسی گرہ تھی کہ تنوں نے وا نہ کی
تیروں کے بند قطع کمانوں کے ساتھ تھے

سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو
صاف آتی تھی پسینے سے جن کے وفا کی بو
نازک کلائیاں تھیں کہ پہونچے بلور کے
چاروں سم اُن کے غیرتِ ماہِ منیر ہیں
یال ایسی جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو
پہونچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
دو تیر آگے تیز نظر سے نکل گئے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے
برگستواں میں جسم کہ رستم تھا درعہ پوش
گرتا تھا منہ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش
بالکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی
بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
وہ کلغیاں کہ طرّۂ لیلیٰ سے سرفراز
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں
پر ایڑیاں جمی ہوئی تھیں مثلِ بو تراب
بیجا قدم رکھیں یہ سمندوں کو تھی نہ تاب
حیدر سے شہسوار کی یہ ران باگ ہو
فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ کی
کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی
حلالِ مشکلات کے بچوں کے ہاتھ تھے

بچوں کے نیمچے بھی غضب آبدار تھے
دونو بہم جو ہو گئے اُٹھے ذوالفقار تھے
دو کرتے تھے یہ اکب و مرکب کو زین کو

قبضے وہ تکیہ گاہ ظفر جن کا نام ہے
پانی وہ جس کو کہیئے کہ زہر التیام ہے
جوہر وہ دم نکلتے ہیں جس کی مثال پر

فولاد پوش پھینک کے ہتھیار چھپ گئے
چار آٹھ میں جو قتل ہوئے چار چھپ گئے
مشکل وہاں تمیز بد و نیک ہو گئی

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے
چار آینہ جو پہنے تھے چورنگ ہو گئے
دھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں

کوئی بچے نہ رومی و رازی جدھر پھرے
غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر پھرے
مہلت نہ سر اُٹھانے کی تھی فوجِ شام کو

جا پہونچے تھے مقامِ بنِ سعد کے قریب
کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں
بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہیں مکر و کید
چھٹنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید
بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے

سیلِ فنا تھے صاعقۂ شعلہ بار تھے
سائے کو بھی شریک جو کیجے تو چار تھے
دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

پھل وہ کہ جس کو کھاتے ہی قصہ تمام ہے
کاٹ ایسا سنگِ سخت جہاں موم خام ہے
افشاں چنی ہوئی ہے جبینِ ہلال پر

گوشوں میں سر جھکا کے کماندار چھپ گئے
زخموں کے گل بہت جو کھلے خار چھپ گئے
غل تھا کہ لو بہار و خزاں ایک ہو گئی

لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے
بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے
اللہ رے مصاف صفیں صاف ہو گئیں

جھک جھک گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
پسپا تھے یکہ تاز وہ تازی جدھر پھرے
دونا بلند کر گئے جعفر کے نام کو

بھاگا عقب سے چیر کے خیمے کو وہ لعیں
ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوئے دیں
یہ دونو بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

دیکھا حضور چھٹ گیا پنجے میں آ کے صید
فرمایا عون نے یہ ہے اُستادِ زرق و شید
سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے

بڑھکر پکارے حضرتِ عباسِ عرش جاہ
ذلّت اٹھا کے بھاگ گیا افسرِ سپاہ
سرسبز ہوتے ہیں ہیں جب کھیت پڑتے ہیں
ہاں مرد اگر ہو سامنے بچوں کے آتو جائے
مخفی کدھر ہو شیروں کو صورت دکھا تو جائے
بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تو لے
بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی
آخر شغال تھا نہ وہ بکنے کی خو گئی
جب کچھ کڑی پڑی تو جفا جو نکل گیا
مرتا ہے بے حیا زر و جاگیر و مال پر
آنکھیں چرائیں شبیر جب آئے جلال پر
پائے نہ گر شکار تو جانباز کیا کرے
باتوں میں اتنا تھم جو گئے وہ فلک پناہ
دریا کی فوج اُدھر سے ہوئی بڑھکے سدِّ راہ
پتھر بھی تیرِ ظلم بھی نیزے بھی چل گئے
یوں تیر کھاکے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر
لشکر کو کر دیا تھا زبردستیوں سے زیر
دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا
تیغیں قریب سے جو لگاتے تھے اہلِ شر
عباس بڑھکے دبتے تھے حضرت کو یہ خبر
نامی جوان بھاگ گئے شام و روم کے

کس سمت ابن سعد ہے اور شمر روسیاہ
روکے گئے نہ ایک سے دو طفل واہ واہ
یوں لشکروں سے شبیر کے فرزند لڑتے ہیں
بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے
بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے
گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے
عزّت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی
خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی
ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا
اک پیچھے کا وار بھی روکا نہ ڈھال پر
سردار ہو کے چھپ گیا تف اس جدال پر
کنجشک جب نہاں ہو تو شہباز کیا کرے
خیمے کو لیکے پشت پہ سب جم گئی سپاہ
چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشکِ ماہ
سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے
غصّے میں جس طرح کہ جھپٹتا ہے زخمی شیر
انبار ادھر سروں کے اُدھر زخمیوں کے ڈھیر
تلوار جس پہ سن سے چلی سرد ہو گیا
اک بھائی بڑھکے ہوتا تھا اک بھائی کی سپر
کیا کیا لڑے ہیں آپ کی ہمشیر کے پسر
خیمے پہ جا پڑے پسرِ سعد شوم کے

پر اب خدا بچائے کہ فوجیں کثیر ہیں
رو کر امامِ دیں نے کہا اب اخیر ہیں
نو دس برس میں ماں سے بچھڑنے کے دن نہ تھے

زینب کھڑی تھی پردے کے پیچھے جو بے قرار
کیا کیا لڑے ہیں حیدر و جعفر کے یادگار
جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
مجکو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر باحواس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہونچتی نہیں نگاہ
آوازِ دار و گیر تو گردوں پہ جاتی ہے

طبلِ ظفر پہ چوب لگی یک بیک اُدھر
عباسؑ نے کہا شہِ والا سے دوڑ کر
گھبرا کے کشمکش میں دم اُن کے نکل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسمِ شیریں سخن بڑھے
مانندِ شیر اکبرِ گل پیرہن بڑھے
پردے میں اہلِ بیتِ نبی کے خلل نہ آئے

پہونچے یہ تین شبیر جو مقتل میں ایک بار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار
دُنیا سے وقتِ کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے

تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سنانیں ہیں تیر ہیں
کب تک لڑیں کہ تشنہ دہن ہیں صغیر ہیں
یہ کھیلنے کی فصل تھی لڑنے کے دن نہ تھے

فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسِ نامدار
رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

میں اُن کی اک کنیز یہ دونوں پسر غلام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام
بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمہ کے پاس ہیں

ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ
وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
دونوں کے نیمچوں کی چمک یاں تک آتی ہے

ڈیوڑھی سے آئیں خیمہ میں زینب جھکائے سر
چلیئے حضور لُٹ گیا بنتِ علی کا گھر
لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

عباس کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے
فرزند سے یہ کہہ کے امامِ زمن بڑھے
ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار
بند آنکھیں منہ کھلے ہوئے ہونٹوں پہ جانِ زار
گردن میں ایک بھائی کے بھائی کا ہاتھ ہے

بچّوں کو جاں کنی میں جو پایا حسین نے
آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسین نے
آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے

پہونچے قریبِ خیمہ جو شاہِ فلک سریر
پردہ اُلٹ کے خیمہ کا با حالتِ تغیر
دَوڑو حسین خیمہ میں لاشوں کو لاتے ہیں

دَوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم
رابہت کے نیچے بچّوں کے بہنیں میّتیں بہم
لاشوں کے آگے اکبر یوسف جمال تھے

ماتم کی صف سے اُٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات
لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطانِ کائنات
لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے

بیٹھی تھیں ایک گوشہ میں زینب جو ننگے سر
پُرسے کو لوگ جمع ہیں چلیئے ذرا اُدھر
آتی آئمہ کی۔ دل کو جلائے تو کیا کروں

بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اجڑ چکے
اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیئے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین
رووں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے

بوسے لیئے گلے سے لگایا حسین نے
ہاتھوں سے بچّوں کو چھوڑایا حسین نے
چھوٹے کی لاش قاسمِ نوشاہ لے چلے

تھا غیر حال مر گئے رستے میں وہ صغیر
فضّہ پکاری اے حرمِ شاہِ قلعہ گیر
دولھا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں

ڈیوڑھی سے پہلے آیا لچکتا ہوا علم
آپہونچے لڑکھڑاتے ہوئے سرورِ امم
کپڑے ہر اک کے خون سے بچّوں کے لال تھے

لوگو بتاؤ کون سے دولھا کی ہے برات
دَوڑیں لٹا کے بچّے کو بانوئے خوش صفات
لاشوں کے گرد آکے حرم پیٹنے لگے

واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر
فرمایا میں نہ جاؤں گی بچّوں کی لاش پر
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

لاشوں پہ لائیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچّے بچھڑ چکے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیئے

بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین
کیوں کر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسانِ کردگار
لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہوگا بے قرار
چلیئے نہ ضبط کیجیے فریاد و آہ کو
لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر

بولیں بڑھا کے دستِ مبارک اِدھر اُدھر
کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو

دیکھو نہ آنچ آئے شہِ خوش خصال پر
کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اُٹھو اُٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اُتارو اُٹھو اُٹھو
اِن پیاری پیاری آنکھوں پہ امّاں نثار ہو

سینوں سے تو زمیں پہ کھو ہاتھ اُتار کے
امّاں نثار گیسوؤں کے تار تار کے
نخلِ مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے
لاکھوں سے معرکہ میں وغا کر کے آئے ہو

دولھا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو
مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
کیونکر ملے گا ماں کو تمھارا سراغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے

ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
رونا ہے واں بھی میں تمھیں روؤں گی زار زار
کی عرض آپ صاحبِ ماتم ہیں میں نثار
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہے شاہ کو

ماتم کی صف پہ گر پڑیں وہ سوختہ جگر
بچے کدھر ہیں کچھ مجھے آتا نہیں نظر
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں
اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر رکھو

آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر
ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اُٹھو اُٹھو
اُلجھے ہیں گیسوؤں کو سنوارو اُٹھو اُٹھو

انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو
باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
چونکو اُٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خوابِ مرگ ہے

بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو
صدقے گئی رُلانے کو مادر کے آئے ہو
ارمان شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے
لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے

میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
امّاں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے
اُلجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے
سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ تخت شہیدوں کو چاہیئے
مرنا یوہیں جہان میں سعیدوں کو چاہیئے

تابوت اُٹھاتی دھوم سے مرتے وطن میں گر
ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے نوحہ گر
قبریں بناتی ماں کی لحد کے اِدھر اُدھر
کیا حشر ہوگا پہونچے گی یثرب میں جب خبر
ام البنین پیٹتی روضے پہ جائیں گی
صغرا کے پاس بی بیاں پُرسے کو آئیں گی

بچّو تمھیں بتاؤں میں غربت میں کیا کروں
گھر ہے نہ یہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

مجبور تم بھی ماں بھی ہے ناچار ہیں نثار
تنہائی میں خدا ہے مددگار ہیں نثار
رستہ بُرا ہے باندھ لو ہتھیار ہیں نثار
چھوٹے مرے پسر سے خبردار ہیں نثار
اللہ اس سفر کی بلاؤں کو رَد کرے
کھٹکا جہاں ہو بھائی کی بھائی مدد کرے

سُنتی ہوں اس سفر میں خطر بے شمار ہیں
جائیں وہی اسے جو میانِ مزار ہیں
پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جائیو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو
کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو
کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو
بھیجو گے کب پیام وسلام اے مسافرو
پیٹوں گی جنگلوں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی مقتل میں آؤنگی

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں
بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں
ہے ہے یہ دشتِ ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہونچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے روؤ گے
واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤ گے

شب کو خوشامدیں مری کرتے تھے بار بار
ان بھولی بھولی باتوں کے ماں ہو گئی نثار
اب واری سرخرو ہوئے تم رب کے سامنے
یہ بین کرکے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر
اِک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر
بچّوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
بس اے انیسؔ طول سے بہتر ہے اختصار
خالق سے ہاتھ اُٹھا کے دُعا کر بہ انکسار
ہردم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو

تا دودھ ہم کو بخش دے مادرِ جگر فگار
باتیں وہ رات کی مجھے بھولیں گی نہ وہ پیار
لو دودھ میں نے بخش دیا سب کے سامنے
غش آیا سانس اُلٹ گئی۔ ٹکڑے ہوا جگر
بانو پکاری سوئے علمدار دیکھکر
لاشے اُٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے
ہاں ختم کرکے مرثیۂ شاہِ نامدار
قایم رہے جہاں میں یہ شاہِ فلک وقار
حامی جنابِ فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

رُباعی

خوں بھائی کا شہ کے روبرو بہتا تھا
تھا بیچ میں سقائے حرم کا لاشہ
پیاسے کا لہو کنارِ جو بہتا تھا
دریا تو اُدھر اِدھر لہو بہتا تھا

مرثیہ (۱۰)

جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدر فرات پر
طاری ہے خوفِ مرگ ہر اک ذی حیات پر
صدمہ عجب ہے بادشہِ کائنات پر
آنکھوں سے اشک بہہ رہے ہیں بات بات پر
بجھتا ہے وہ جو قبرِ علی کا چراغ ہے
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا داغ ہے

صابر کا ہے یہ حال کہ مشکل ہے ضبطِ آہ
فرماتے ہیں کہ تھام لے بندے کو یا الٰہ
کیا مرحلہ ہے سخت یہ کیونکر کٹے گی راہ
بھائی مرا یہی ہے یہی لشکر یہی سپاہ
آخر بشر ہوں میں جو نہ روؤں تو کیا کروں
تیغِ علی کو ہاتھ سے کھوؤں تو کیا کروں

دوری کا غم ہے کیوں نہ بہیں اشک متصل
پالا ہے بر میں آہ ہٹے کس طرح سے دل
اعضا کو توڑے دیتا ہے پُردردِ جاں گسل
اے موت آکہ روحِ علی سے نہ ہوں خجل
رخصت کا حرف لب پہ بھی لایا نہ جائے گا
مجھ سے تو یہ پہاڑ اُٹھایا نہ جائے گا

یہ نوجواں بضاعتِ حیدر ہے یا کریم
حمزہ یہی مرا یہی جعفر ہے یا کریم
پیارا پسر سے بھی یہ برادر ہے یا کریم
یوں سب ہیں پر اسی سے مرا گھر ہے یا کریم
بازو یہی ہے ہاتھ مرے اس کے ہاتھ ہیں
میں جانتا ہوں شیرِ خدا میرے ساتھ ہیں

زینب کے لال مر گئے لشکر بچھڑ گیا
سہرا دکھا کے قاسمِ بے پر بچھڑ گیا
وہ کیا شہید ہو گئے سب گھر بچھڑ گیا
پھر میں نہیں اگر یہ برادر بچھڑ گیا
اس معرکہ میں ذبح ہوں پہلے تو عید ہو
سبطِ نبی کے بعد یہ بھائی شہید ہو

حضرت اِدھر تڑپتے ہیں تھامے ہوئے کمر
عباس بی بیوں سے ہیں رخصت طلب اُدھر
لائی ہے سوکھی مشک سکینہ بچشمِ تر
فرماتے ہیں بھتیجی کا مُنہ چوم چوم کر
پہلے تھا ذکر آپ تسلّی کے واسطے
اب جاکے پانی لاتے ہیں بی بی کے واسطے

کہتی ہی خشک ہونٹ دکھا کر وہ لالہ فام
اصغر کو لیکے ہاتھوں پہ بانوئے نیک نام
دکھلاؤ اس کا حال شہِ نامدار کو

کرتے ہیں عرض حضرتِ عباسِ نامدار
پر کیا کروں رضا جو نہ دیں شاہِ ذی وقار
رخصت ہیں سعی کیجے کہ ہو نام آپ کا

کچھ سوچ کر یہ کہنے لگی وہ شکستہ حال
جیتا ہی تم کو دیکھ کے خیر النسا کا لال
بانو نے مرتضےٰ کی کمائی کو کھو دیا

زینب یہ بولیں آپ کا وسواس ہی بجا
پانی بھی مل رہے گا صغیروں کا ہی خدا
موقع نہ سعی کا ہی نہ مشکل کشائی کا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش صفات
مشکیزہ لیکے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات
ہر وقت کربلا سے طلبگارِ خیر ہوں

جس جا حسین بیٹھے تھے عریان سر کیئے
کی عرض تا کجا کوئی خونِ جگر پیئے
ہچکی لگی ہی اصغرِ ناشاد کام کو

فرمایا میری مرگ گوارا کرو تو جاؤ
اچھا سکینہ جس میں خوشی تمہیں لے لاؤ
ثابت ہوا کہ ہاتھ سے عمو کو کھوؤگی

اب عمّو جان مجھ میں نہیں طاقتِ کلام
فرماتی ہیں کہ مرتا ہی ہی ہی یہ تشنہ کام
ہچکی لگی ہوئی ہی مرے شیرخوار کو

بچوں پہ جان دینے کو حاضر ہی جاں نثار
چلیئے پسر کو لیکے وہاں بہرِ کردگار
وہ کام ہی غلام کا یہ کام آپ کا

کیا کہتے ہو نہ بھائی یہ میری نہیں مجال
نیکی بدی ہو کچھ تو کہیں شاہِ خوش خصال
بچّوں کے واسطے مرے بھائی کو کھو دیا

کیونکر دلاوے بھائی سے ان کو کوئی رضا
تنہا نہ ہوں جہاں ہیں شہنشاہِ کربلا
یہ چل بسے تو کون ہی پھر میرے بھائی کا

بی بی بھلا یہ کون سے وسواس کی ہی بات
پھر ننھے ننھے بچّوں کی کس طرح ہو حیات
آگے جو کچھ سبھوں کی رضا ہیں تو غیر ہوں

واں خود گئے بھتیجی کو آغوش میں لیئے
پانی کہیں سے آئے تو یہ جاں بلب جیئے
مولا بس اب نہ رو کیئے اپنے غلام کو

مشکیزہ بھر کے چاند سی چھاتی پہ زخم کھاؤ
یہ کیا سکھا کے لائی ہو بی بی ادھر تو آؤ
پانی کو اب تو روتی ہو پھر ان کو روؤگی

انجام کی خبر نہیں کچھ تم کو ہائے ہائے
یہ اودے اودے ہونٹ بھی تم نے کیوں دکھائے
جبراب دُعا کرو کہ یہ اعدا پہ فتح پائے
دولت ولیِ حق کی مرے ہاتھ سے نہ جائے
جب مشک بھر کے دوش پہ یہ نیک خو رکھے
دریا کا معرکہ ہے خدا آبرو رکھے

گردن جھکا کے شرم سے بولی وہ مہ جبیں
پوچھیں حضور میں نے کچھ ان سے کہا نہیں
اصغر کو لائیں گود میں جب بانوے حزیں
ہاں مشک دی قصور یہ ہے یا امامِ دیں
مجرم ہو جو لب پہ حرفِ شکایت بھی آئے ہوں
لیجے قسم زباں کے جو کانٹے دکھائے ہوں

یہ سُن کے گود میں لیا اُس تشنہ کام کو
عباس خم ہوئے شہِ دیں کے سلام کو
باقی رہی نہ ضبط کی طاقت امام کو
لپٹا لیا برادرِ عالی مقام کو
حالت جو غیر ہو گئی زہرا کے جائے کی
قبرِ علی سے آئی صدا ہائے ہائے کی

بوسہ قدم پہ دے کے وہ شیرِ ژیاں چلا
غل پڑ گیا کہ یاورِ شاہِ زماں چلا
چلائے اہلِ بیت کہ راحت رساں چلا
لو فاطمہؓ کے گھر سے علی کا نشاں چلا
سادات کس بلا میں گرفتار ہو گئے
ہے ہے حسین بیکس و بے یار ہو گئے

اللہ رے رعب آمدِ عباسِ عرش قدر
سینوں میں دل چھپے ہوئے تھے جوشنوں میں صدر
غل ہے قریب تر ہے سپہرِ وغا کا بدر
زہرے ہیں آب گھاٹ سے بھاگے ہیں اہلِ غدر
آتا ہے ابنِ ضیغمِ یزداں لڑائی کو
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہے ترائی کو

لشکر میں ایک ایک کو ہے زندگی سے یاس
ڈر سے کسی کے ہوش ٹھکانے ہیں نہ حواس
وہ دور دور سب ہیں صفیں تھیں جو پاس پاس
آمد میں شیر کی بھی یہ ہوتا نہیں ہراس
غل چار سو یہ ہے کہ قدم سر کے جاتے ہیں
گھوڑے بھگاؤ حضرتِ عباس آتے ہیں

وہ عازمِ وغا ہے جو شیروں کا شیر ہے
روتا ہے دل کے بھائی سے بھائی یہ دیر ہے
زور آوری سے اُس کی تہمتن بھی زیر ہے
جرار ہے شجاعِ جہاں ہے دلیر ہے
لرزہ ہے اُن کے تن میں جو مردِ نبرد ہیں
شیروں کے ہاتھ پاؤں ترائی میں سرد ہیں

رن سے قدم اُٹھائے ہوئے ہیں سرانِ فوج
دہشت سے منہ چھپائے ہیں تیغیں میانِ فوج
رایت تمام خوف سے تھرّائے جاتے ہیں

مانند بید کانپ رہے ہیں جوانِ فوج
دامن لپیٹتے ہیں کمر سے نشانِ فوج
لشکر کے بھاگنے کے نشاں پائے جاتے ہیں

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم
شوکت وہ اُس جناب کی وہ رفعتِ عَلَم
ذرّوں سے شرمگیں تھے گہر لعل سنگ سے

نصرت نے گرد پھر کے لیے بوسۂ قدم
پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم
صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے رنگ سے

وہ ضو علم کی وہ رُخِ عباسِ نامور
پنجہ اُدھر عَلَم کا رُخِ پُرضیا ادھر
یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں

رکھے تھا ہاتھ چہرے پہ خورشید خیرہ سر
دو نورِ سرمدی تہہ و بالا تھے جلوہ گر
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں

پنجے سے نورِ پنجتنی آشکار رہی
دامن بھی ابرِ رحمتِ پروردگار رہی
کشتی کا بادبان ہو تو کوثر پہ جا لگے

پرچم پہ طرۂ سرِ حور انتشار رہی
پہونچا جو اُس کے سایہ میں وہ رستگار رہی
طوبیٰ نہال ہو اگر اُس کی ہوا لگے

ناگاہ غل ہوا فرسِ تیز گام لاؤ
ہاں رخشِ تیز رو کو بصد اہتمام لاؤ
ہے انتظار ابرشِ آہو شکار کا

آیا علی کا سروِ رواں خوش خرام لاؤ
اسپ گراں رکاب و مرصع لجام لاؤ
بیٹا سوار ہوئے گا دلدل سوار کا

آیا فرس سجا ہوا کس ترک و تاز سے
رکھتا تھا پاؤں خاک پہ اس امتیاز سے
فوق اُس کو تھا ہمائے سعادت نشان پر

سرعت کا قافلہ نکل آیا حجاز سے
جیسے پری چمن میں خراماں ہو ناز سے
سم تھے زمین پر تو دماغ آسمان پر

وہ تھوتنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
کیلیں نجوم نعل ہلال اور سم قمر
کھاتی تھی ہر پری بھی قسم اُس کی جان کی

وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر
باریک جلد سینہ کشادہ بلند سر
غصّہ یہ تھا کہ تنگ ہے وسعت جہان کی

دلدل نژاد برق تجلّی براق سیر
اسوار دم دلاسے سے گر پھیر لے تو خیر
سرعت غضب ہے گو کہ وہ بے آب و دانہ ہے
سایہ کا اُس کے دھوپ میں سرعت سے تھا یہ حال
گہہ بر میں گاہ بحر میں گاہے سوئے جبال
سایہ نہ تھا ہمائے سعادت پناہ تھا

وہ شوخیاں فرس کی وہ سرعت وہ آؤ جاؤ
جب چاہو سیر عالمِ امکاں کی دیکھ آؤ
رفعت میں پست حوصلہ کبکِ دری کا تھا

لو اب سوار ہوتے ہیں عباسِ نامور
لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھّا ایال پر
برچھا لیا سمند کو زانو میں داب کے
بڑھنے میں صرف ہاں جو دہن سے نکل گیا
لشکر گلوں کی بو کا چمن سے نکل گیا
طاؤس کیا کہ برق بھی شرما کے رہ گئی

گھوڑا اُڑا کہ ہو گئی سرعت ہوا کی گرد
جا پہونچی تا بہ فرقِ ثریا ثرے کی گرد
خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر

شوکت وہ اُس فرس کی وہ عباس کی نمود
غل تھا کہ ہر ثنا ہے پئے واجب الوجود
سب کے گلوں میں اُن کی غلامی کا طوق ہے

دریا میں موج دشت میں آہو ہوا میں طیر
گر سانس لی تو دم بھی نہ لے پھر فلک بغیر
اُس کو تو نبض کی حرکت تازیانہ ہے

وحشت میں جس طرح سے بھرے چوکڑی غزال
گم کردہ آشیاں تھا عقابِ کشادہ بال
گویا ہوا کے زور میں شاہیں تباہ تھا

شوخی فقط جسے ہیکل کا اِک بناؤ
تازی ہو موج پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ
چھل بل ہرن کی تھی تو جھگڑا پری کا تھا

لو دامنِ قبا نے لیا بوسۂ کمر
لو آفتاب خانۂ زیں پر ہے جلوہ گر
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے
وحشی غزال دشتِ ختن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا تھا کہ سن سے نکل گیا
پچھلے سموں کی گرد نظر آ کے رہ گئی

بوئے چمن تھی یا قدمِ بادپا کی گرد
اُڑ کر سپہرِ فلک پہ گئی کربلا کی گرد
نخوت سے تھا زمیں کا دماغ آسمان پہ

پڑھتا تھا کوئی شخص تبارک کوئی درود
کیا ان کے سامنے کسی انساں کی ہست و بود
یہ وہ بشر ہیں جن کو ملایک پہ فوق ہے

پیدا مثالِ حیدرِ کرّار رعبِ حق — چمکا جو نورِ عرش بنا خاک کا طبق
رخسار تھے کہ سورۂ والشمس کے ورق — ازبر تھا خط کو آیۂ واللیل کا سبق
موتی کی آگے دانتوں کی کچھ آبرو نہ تھی — سورہ تھا نور کا وہ بیاضِ گلو نہ تھی

وہ ہاتھ کارِ خیر رہا جن سے روز و شب — ساعد تھے صاف ساعدِ پُر نورِ شیرِ رب
بازو وہ جن میں قوتِ دستِ خدا تھی سب — شانے وہ جن میں شانِ نشانِ شہِ عرب
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ بھرا رہا — سینہ وہ صدر تھا جو وفا سے بھرا رہا

شان و شکوہ و صولت و عدل و نہیب و داد — اسلام و دین و ملّت و ایمان و اعتقاد
اشفاق و رحم و دوستی و خلّت و وداد — خوف و رجا و آرزو و مطلب و مراد
اندوہ و درد و رنج مطیعانِ نو میں تھے — سب غاشیہ[1] بدوشِ فرس کی جلو میں تھے

شوکت کا قول تھا کہ مطیعِ جناب ہوں — کہتی تھی فتح خاکِ درِ بوتراب ہوں
نصرت کا ادّعا تھا کہ میں کامیاب ہوں — دعویٰ تھا قہر کو کہ علی کا عتاب ہوں
فاقے سے تھے پہ صبر بھی منہ موڑتا نہ تھا — ہر گام پر ثبات قدم چھوڑتا نہ تھا

تلوار وہ ہلال کٹے جس کو دیکھ کر — تھی کہکشاں کمندِ عدو بندِ شیرِ نر
مہتابِ آسمانِ ظفر آہنی سپر — خود آفتاب تھا تو جبینِ مبیں قمر
رُخ کے عرق سے نور کے قطرے ٹپکتے تھے — حلقے نہ تھے زرہ میں ستارے چمکتے تھے

نیزے کی نوک سے جگرِ آفتاب خوں — سینہ ہے آسماں کا اُسی دن سے نیلگوں
ابروئے حور فتح و ظفر تھا کماں کا نوں — تھا ماہِ نو بھی جس کے چم و خم سے سرنگوں
دہشت سے گوشہ گیر رئیسانِ شام تھے — ترکش کے سائے تیرِ اجل کے پیام تھے

نیزہ زمیں میں گاڑ کے گونجا جو شیرِ نر — چہروں سے رنگ اُڑ گئے تھرّا گئے جگر
نکلے رجز میں خشک زباں سے وہ شعرِ تر — جس کے جواب میں فصحا نے جھکائے سر
قفل تھا زبانِ ناطقہ اَلکن ہے لال ہے — لا ریبَ فیہ مصحفِ ناطق کا لال ہے

[1] گھوڑے کا زین پوش

نعرہ یہ تھا کہ گوہرِ برجِ شرف ہوں میں
فرزندِ صاحبِ شرفِ مَن عرف ہوں میں
فخرِ سلف جو شاہ ہے اُس کا خلف ہوں میں
اللہ و پنجتن ہیں جدھر اُس طرف ہوں میں
رایت سے پیش رو ہوں خدا کی سپاہ کا
پیرو ہوں بادشاہِ ہدایت پناہ کا

حیدر کی ذوالفقار سے لاکھوں کے سر کٹے
جوشن ہیں سینے سینوں کے اندر جگر کٹے
خیبر میں جبرئیل کے بھی تین پر کٹے
پریوں کٹے کہ تیغ سے جیسے سپر کٹے
ضربت کا حال عمرِ دلاور سے پوچھیے
حیدر کا زور مرحب و عنتر سے پوچھیے

بچوں کا ایلچی بھی ہوں اور تشنہ کام ہوں
سقّائے اہلِ بیتِ رسولِ انام ہوں
شبیر کی سپر ہوں علی کی حسام ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں شہِ دیں کا غلام ہوں
سینے پہ تیر کھاؤں گا تلواریں کھاؤں گا
یہ مشک آبِ نہر سے میں لیکے جاؤں گا

یوں تو ہیں تین روز سے بے آب و دانہ سب
لیکن قریبِ مرگ ہیں وہ طفلِ تشنہ لب
کیوں آل کو ستاتے ہو بے جرم و بے سبب
کچھ مصطفےٰ کا پاس نہیں تم کو ہے غضب
دو دن تو بیکسوں پہ عطش میں گزر گئے
کس پر یہ خون ہوگا جو معصوم مر گئے

ہم اپنا سر کٹانے کو حاضر ہیں ظالمو
تیغوں میں بھوک پیاس میں صابر ہیں ظالمو
بچے بھی میہماں کے مسافر ہیں ظالمو
آثارِ مرگ چہروں پہ ظاہر ہیں ظالمو
گر ہم تمھارے زعم میں تقصیر وار ہیں
پر اُن کا کیا قصور ہے جو شیر خوار ہیں

یہ دھوم ہے خیام کا تپتا ہے گرم بن
مرجھا گیا ہے احمد مختار کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ جیئیں گے وہ گلبدن
گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹھ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلّایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لیئے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

ایسا سخن کبھی جو سُنا تھا نہ کان سے
جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے
نعرہ کیا کہ او سگِ ناپاک دور ہو

حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام
سوکھی ہوئی زباں جو ہلا دے وہ تشنہ کام
قدرت ہے جب طرح کی امامِ جلیل کو

کیا جانے مرتبہ پسرِ فاطمہ کا تو
سردار بُردبار نکوکار نیک خو
جاری ہے فیض فاطمہ کے نورِ عین کا

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں
شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
ثابت ہوا کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار
زیرِ زمیں تو گاوِ زمیں کو نہ تھا قرار
غل تھا علی کی تیغ کا سب سے الگ ڈھنگ ہے

اقبال و تندرستی و آسایش و قرار
حلم و سکون و راحت و آرام و اختیار
آثارِ قہرِ حق اُنھیں معلوم ہو گئے

غل تھا چمکتی آتی ہے تیغِ اجل چلو
دب کر صدا غرور نے دی سر کے بھل چلو
دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے

برچھی لگی مگر نہ کہا کچھ زبان سے
بس خود بخود اُگلنے لگی تیغ میان سے
یہ کیا سخن ہے منہ میں ترے خاک دور ہو

ظالم شراب خوار کی بیعت کرے امام
حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام
چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

عزّت بہشت کی ہے تو کوثر کی آبرو
اُن کا عدو خدا و پیمبر کا ہے عدو
غاصب ہے تو یہ نہر بھی ہے حق حسین کا

آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ زماں
دہشت سے تھرتھرا گیا مریخِ آسماں
غل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر اُلٹ گیا

پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار
تھرّا رہا تھا ثورِ فلک وقتِ گیر و دار
جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

امن و امان و صبر و توانائی و وقار
رعب و ثبات و سرکشی و قدر و اقتدار
سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو
بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو
دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

ڈھالوں سے شامیوں کی اُدھر چھا گئی گھٹا
ایسا بڑھا یا ابر کہ شرما گئی گھٹا
کشتوں کو اپنے فوجِ عدو روندنے لگی
چمکی جو تیغ آمدِ قہرِ خدا ہوئی
سینے سے روح جسم سے گردن جدا ہوئی

باڑھ اس غضب کی وار وہ اس زور شور کا
ہر دم تھی معرکے میں اجل اُس کے دم کے ساتھ
رہتی تھی اس طرح ظفر و فتح خم کے ساتھ
ہر دل پہ اس کی شان و جلالت کا نقش تھا
بسم اللہ صحیفۂ نصرت تھی اُس کی ناب

جوہر میں آبرو میں اصالت میں لاجواب
اُترے جگر سے جس کے اُسی کو خبر نہ ہو
پایا تھا باغیوں نے ثمر یہ دمِ جدل
شاخیں کماں کی توڑتا تھا پنجۂ اجل
گوشوں کو ڈھونڈھتے تھے کماں کش ہٹے ہوئے

گوپال و تیغ و خنجر و گرز و سنان و تیر
دم میں یہ صف تمام اُدھر کا پرا اخیر
اُڑ کر بھی مرغِ روح کا بچنا محال تھا
یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغِ شعلہ رنگ
کمروں سے کھینچ نہ سکتے تھے خنجر میانِ جنگ
تلواریں منہ چھپائے تھیں ضربِ درشت سے

دریا پہ جھوم جھوم کے سب آگئی گھٹا
بارانِ تیر دشت میں برسا گئی گھٹا
جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی
ہر پر جو آگئی تو قیامت بپا ہوئی
خوں میں ڈوبچکی تو نہ پھر آشنا ہوئی

دشمن کو اُس کا گھاٹ کنارا تھا گور کا
گرتا تھا خود کٹ کے برابر جھلم کے ساتھ
جیسے ہمیشہ رہتا ہے سکہ درم کے ساتھ
تمغہ نہ کہیے آیۂ نصرت کا نقش تھا

مانند ذوالفقار گراں قدر و انتخاب
وہ قد وہ خم وہ منہ کی صفائی وہ آب و تاب
کاٹے گلے ہزار گئے اور خوں میں تر نہ ہو
ڈھالوں سے پھول اُڑ گئے تھے برچھیوں سے پھل
گرتے تھے سہم کر قدر انداز منہ کے بل
ریتی پہ نخلِ تیر پڑے تھے کٹے ہوئے

دو دو تھے پیش آئینۂ تیغِ بے نظیر
آفت کا معرکہ تھا قیامت کی دار و گیر
جوہر حسام میں تھے کہ لوہے کا جال تھا
لوہے کو خاکِ شور میں کھا جائے جیسے زنگ
جوشن جو کٹ گئے تھے تو چار آئینے تھے دنگ
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

گرتی تھی کوند کر جو وہ تیغِ شرارہ ریز
چلنے میں تیغ تیز فرس تیز ہاتھ تیز
کشتہ تھے ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں
کاٹی سپر تو کاسۂ سر تک پہونچ گئی
بر سے مثالِ برق جگر تک پہونچ گئی
بڑھ کر کمر سے زین پر آئی سرنگ کے

اُن کے قدم بھی اُٹھ گئے جو سر گزار تھے
بھڑکی تھی آگ نعل در آتش سوار تھے
جاتا تھا یوں غضب میں صفِ اہلِ کید پر

تیغ دو دم سروں سے گزرتی تھی دم بدم
بڑھتی تھی دم بدم تو ٹھہرتی تھی دم بدم
ڈر سے جگر بھی آب تھے نہرے بھی آب تھے

نکلا اُدھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا
کوسوں لہو سے دشتِ ستم لالہ زار تھا
کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی لگے

رہوار نے وغا میں کہاں رستمی نہ کی
مالک سے بیکسی میں کہاں ہمدمی نہ کی
دم سے تھا بحرِ خوں کا کنارا لگا ہوا

جس سمت گر کے تیغ کا سایہ گزر گیا
خالی ہوئی یہ صف وہ پرا خوں میں بھر گیا
گرتا تھا خود جری پہ جری ماجرا یہ تھا

دوزخ کھلا تھا بند تھے سب کوچہ گریز
رہ رہ کے گرم ہوتا تھا ہنگامۂ ستیز
ششدر یہ تھے سب کہ موت سے کیونکر دوچار ہوں

سر پہ پڑی تو پیر کے بر تک پہونچ گئی
پی کر لہو جگر کا کمر تک پہونچ گئی
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے

ممکن نہ تھا قرار کہ دل بے قرار تھے
ٹاپیں فرس کی تھیں کہ سروہی کے وار تھے
شیرِ ژیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر

دوزخ میں فوجِ شام کی بھرتی تھی دم بدم
ندی لہو کی چڑھ کے اُترتی تھی دم بدم
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

پیدل ہو یا سوار وہ ڈوبتا یہ چارہ تھا
بجلی چمک رہی تھی فرس بے قرار تھا
سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

شمشیرِ جاں ستاں نے کہاں برہمی نہ کی
سو مرتبہ چلی پہ بُرش نے کمی نہ کی
جانوں کا گھاٹ پر تھا اُتارا لگا ہوا

پہونچوں سے دونوں ہاتھ اُڑے تن سے سر گیا
گھوڑے سمیت گر کے یہ تڑپا وہ مر گیا
بسمل بھی لوٹتے تھے برابر مزا یہ تھا

فتح و ظفر بھی غاشیہ گیر و رکابدار
جوہر تھے یا کہ سلسلۂ زلفِ تابدار
اک شور تھا کہ زیست کا عرصہ قلیل ہے

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو
سر ہر قدم پہ تھے تنِ کفار سے جدا
چلّے تھے برسر لبِ سوفار سے جدا
زہگیر کیا کرے جو نہ ترکش میں تیر ہوں

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلواں کے پاؤں
اُٹھ اُٹھ گئے سپاہِ ضلالت نشاں کے پاؤں
ہٹتا بھی ہے جہاد میں حق کا ولی کہیں
جب شیر سے ترائی کی جانب جھپٹ گئے
اب کیا بڑھیں کہ ڈر سے لہو تن کے گھٹ گئے
حملوں کے بعد تنتے تھے یوں نعرے مار کے

ہرنی تھی خوفِ ضربتِ شمشیر سے جدا
پیرِ حزیں جواں سے جواں پیر سے جُدا
سارے عقاب تیرِ غمِ بے پری میں تھے
نیزے کو تولتا ہوا گر کوئی یل بڑھا
کچھ ہاتھ کچھ حسامِ دو دستی کا پھل بڑھا
دو ٹکڑے طول میں جو دمِ امتحاں ہوئے

دکھلا رہی تھی راہِ عدم تیغِ تابدار
تلوار بھی ملی تو بہشتی کو آبدار
پیاسو پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے

سر اُڑ گئے تنوں سے جدا اٹھے عناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو
قبضہ کماں کا دستِ کماندار سے جدا
ڈر سے جدا ہلاک تھے تلوار سے جدا
چلاتے تھے کہ چل کے کہیں گوشہ گیر ہوں

چلنے میں جیسے کانپتے ہیں ناتواں کے پاؤں
رن میں جمے رہے تو اسی نوجواں کے پاؤں
عباس بھی ہٹیں جو بیٹے ہوں علیؑ کہیں
صف آئی صف پہ گھوڑے پہ گھوڑے اُلٹ گئے
جن کے قدم جمے رہے سر اُن کے کٹ گئے
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے ڈکار کے

ناوک کماں سے دور کماں تیر سے جدا
چلّے سمٹ کے ہوتے تھے زہگیر سے جدا
پیکاں میں نہ سری تھی نہ پیکاں سری میں تھے
دریائے قہرِ حق طرفِ پُردغل بڑھا
تلوار سر پہ آئی کہ دستِ اجل بڑھا
غل تھا کہ معنیِ یدِ طولیٰ عیاں ہوئے

رکتی تھی خود پر نہ جھلم پر نہ ڈھال پر
بالا تھا راستی میں قد اُس کا ہلال پر
چشمک یہ دمبدم تھی کہ سرکش ذلیل ہیں
گھوڑوں کے دوڑنے سے اُڑی دشت میں جو گرد
جتنے جواں تھے دفترِ مردانگی میں فرد
تصحیحہ کیسا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
ہر سمت تھا مقدمہ جانوں کا روبکار
اسوار برطرف توندار و رسالہ دار
کیا ابتری سپاہِ ضلالت اثر میں ہے
تسلیم کو جھکے ہوئے تھے باادب نشان
اُٹھتا تھا شور ہاتھ سے گرتے تھے جب نشان
آفت بپا ہے پاؤں تھمے کیا سپاہ کا
جب اُٹھ کے تیغِ صفدرِ قدسی شرف گری
آیا اُدھر خدا کا غضب جس طرف گری
سیفی چلی کہ سیفِ صفِ کارزار پر
آئے جو سوئے نہر صفیں موڑ موڑ کے
تلواریں ٹیکیں خاک پہ دم توڑ توڑ کے
وہ برچھیاں نہ پھر نہ وہ شورِ مصاف تھا
وہ رہ گئے کہ زخموں سے جو چور چور تھے
غازی تھے صف شکن تھے جری تھے غیور تھے
غل تھا کہ اب بچیں گے نہ ہم اس لڑائی میں

حیرت تھی فوجِ شام کو اس چال ڈھال پر
جوہر فروتنی کے بھی تھے اس کمال پر
چلتے ہیں جھک کے وہ جو نجیب و اصیل ہیں
مقتل بھی زرد تھا فلکِ نیلگوں بھی زرد
چہرے کٹے ہوئے تھے انھیں کے دمِ نبرد
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا
آتی تھی موت جائزہ لینے کو بار بار
طبلق لیئے تھے منشی فوجِ ستم شعار
غل تھا چلو کہ فوج کی بھرتی سقر میں ہے
لشکر میں برہمی تھی سلامت تھے سب نشاں
نوبت یہ ہے تو فوج کا مٹنا ہے اب نشاں
سکہ پڑا ہے ضربِ علمدارِ شاہ کا
گویا کہ برقِ سطوتِ شاہِ نجف گری
کٹ کر گرا پرے پہ پرا صف پہ صف گری
گھوڑے گرے پیادہ پہ پیدل سوار پر
بھاگے کماں ہیں تیر عدو جوڑ جوڑ کے
بھاگے وغا میں گھاٹ کو سب چھوڑ چھوڑ کے
جس مورچے پہ تیغ اُٹھائی وہ صاف تھا
جو تھے قریبِ نہر وہ سب دور دور تھے
دریا پہ اور کوئی نہ تھا بس حضور تھے
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

لڑتا کنارِ نہر جو پہونچا وہ شہسوار
آئی صدائے حضرتِ الیاسِ باوقار
سر بر ہو کون تیغ پکڑ کر جو تو بڑھے
سقائے اہلِ بیت پکارا بچشم تر
پیاسا ہی تین روز کا مختارِ خشک و تر
طوفاں کا دھیان صاحبِ کشتی کو چاہیے

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب
موجیں بڑھیں برائے قدم بوسیِ جناب
لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
پانی سے منہ اُٹھائے جو تھا اسپِ سربلند
بولا ہلا کے سر کو سمندِ وفا پسند
حیواں تو ہوں حضور پہ خوش اعتقاد ہوں

فرمایا آپ نے مرے غم خوار مرحبا
تو اپنی خانہ زادی کا حق کر چکا ادا
پانی سے ای فرس تجھے جب اجتناب ہو
دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
تنہا پہ بے وطن پہ ہوا پھر ہجومِ عام
اِک شور تھا کہ بڑھنے نہ دو اس دلیر کو

گھوڑا کہیں گھرا کہیں اُڑ کر نکل گیا
نعروں سے مر گیا کوئی کوئی دہل گیا
ششدر ہے لیکے لاکھوں سے کب تک وغا کریں

خوں پوچھ کر رکھی تہہِ ران تیغِ آبدار
ای نورِ عینِ ساقیِ کوثر ترے نثار
دھو ہاتھ منہ کہ نہر کی بھی آبرو بڑھے
ہیں ہاتھ دھو کے جان سے آیا ہوں نہر پر
بچے تڑپ رہے ہیں لہو ہی مرا جگر
بچوں کی پہلے فاکہ بہشتی کو چاہیے

آنکھیں قدم سے ملنے لگے دوڑ کر حباب
اُچھلیں عَلَم کے چومنے کو ماہیانِ آب
کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں
ڈھیلا کیا دلیر نے خود جھک کے زیر بند
پیاسا ہی ذوالجناحِ شہنشاہِ ارجمند
ہیں بلکی تو ابنِ فاطمہ کا خانہ زاد ہوں

ڈگتا نہیں کبھی قدمِ صاحبِ وفا
پیشِ خدا بزرگ ہی صابر کا مرتبا
سیراب کس طرح پسرِ بوتراب ہو
پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح آئی فوجِ شام
پھر ہر طرف سے چلنے لگے نیزہ و حسام
کشتہ کرو ترائی میں حیدر کے شیر کو

جو ڈر کے گر پڑا وہ سموں سے کچل گیا
صف بچھ گئی اُدھر کی جدھر وہ اُچھل گیا
کیوں ای بہادرو کہو عباس کیا کریں

برسے جو وہیں ہزار کمانوں سے تیرِ کیں
غربال ہو گیا تنِ عباسِ مہ جبیں
وار اپنا کر گیا جو برابر سے اک لعیں
بالائے خاک کٹ کے گرا بازوئے یمیں
مُڑ کر نگاہ کی کہ الٰہی یہ کیا ہوا
اک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی جدا ہوا

ٹھنڈا جو ہو گیا عَلَمِ شاہِ دیں پناہ
عباسِ نامور نے بھری دل سے ایک آہ
دانتوں سے پکڑی مشک کہ محنت نہ ہو تباہ
مشکیزے پر بھی تیر لگا وامصیبتاہ
گھوڑے سے ڈگمگا کے بصد یاس گر پڑے
پانی کے ساتھ حضرتِ عباس گر پڑے

اُٹھ بیٹھے گر کے حضرتِ عباسِ ذی حشم
گھٹنے کے نیچے مشک تھی زانو پہ تھا علَم
جُھک کر زمیں پہ غش میں جو سنبھلا وہ باکرم
گُرزِ گراں غضب سے پڑا سر پہ ہے ستم
ٹکڑے ہوا جگر اسدِ ذوالجلال کا
سر پاش پاش ہو گیا حیدر کے لال کا

مُڑ کر جو فرطِ غیظ سے قاتل پہ کی نظر
مارا کسی نے تیر دلاور کی چشم پر
جھپکی نہ آنکھ واہ رے دل واہ رے جگر
تیور جو آئے جھوم کے سنبھلا وہ شیرِ نر
جوشِ غضب میں خاک پہ بیٹھے تھے شیر سے
گویا لہو ٹپکتا تھا چشمِ دلیر سے

شانوں سے سارے جسم کا جب بہہ گیا لہو
ریتی پہ تھرتھرا کے جھکے آپ قبلہ رو
آواز دی کہ آئیے یا شاہِ نیک خو
سر تن سے کاٹ لینے کے درپے ہیں کینہ جو
خوں میں تڑپ تڑپ کے یہ غم خوار رہ نہ جائے
صدمہ یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے

نکلا حرم سرا سے علمدار کا پسر
گورے گلے میں ہنسلیاں تھیں کان میں گہر
چہرے کا رنگ اُڑا ہوا گرتا عرق میں تر
کی عرض شہ سے ننھے سے ہاتھوں کو جوڑ کر
شاید خبر نہیں ہے امامِ غیور کو
آقا پدر پکار رہے ہیں حضور کو

ڈیوڑھی سے بلبلا کے سکینہ نے یہ کہا
ہاں ہاں سنی تھی میں نے بھی عباس کی صدا
جلدی کسی کو بھیجئے یا شاہِ کربلا
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرے چچا
مر جاؤں گی اگر اُنھیں جیتا نہ پاؤں گی
کیونکر چچی کو ہائے یہ صورت دکھاؤں گی

حضرت نے آہ کی کہ لرزنے لگی زمیں
اب جلد سر کٹانے کو آئیں امامِ دیں
بڑھنے دیا نہ گھاٹ سے آگے دلیر کو
تیروں سے جسم چھن گیا بازو ہوئے قلم
آئے ہیں یاں بپھر کے پرّے اُڑا کے ہم
دنیا سے آج اُٹھ گیا حامل نشان کا
سُنتے ہی اس صدا کے شکستہ ہوئی کمر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر
خورشید کیوں چھپا ہی یہ کیا واردات ہی
عباس کے پسر سے تو کہہ دو کہ گھر میں جائے
فضّہ ابھی خبر نہ کسی رانڈ کو سُنائے
پُرسا تو دوں نجف کی طرف مجھ کو موڑ دو
یہ روزِ قتل حمزہ و جعفر ہی ای پسر
یہ ماتمِ شہادتِ حیدر ہی ای پسر
میرا الم بتول کی جائی سے پوچھیے
غربت میں لُٹ گیا مرا گھر ہائے ہائے
تازہ ہی آج داغِ پدر ہائے ہائے
عباس کیا جہاں سے گئے ہم گزر گئے
کرتا تھا عرض باپ کو تھامے ہوئے پسر
زندہ ابھی ہیں حضرتِ عباسِ نامور
خادم اُٹھائے گا جسدِ پاش پاش کو

ناگاہ اُس سے بڑھ کے پکارے کئی لعیں
کہہ دے کوئی کہ مر گئے عباسِ مہ جبیں
کیا گھیر کر کچھار میں مارا ہی شیر کو
اُفتادہ ہی وہ خاک پہ ٹوٹا ہوا علم
پانی نہ مشک میں ہی نہ عباس میں ہی دم
کٹتا ہی سر ترائی میں کڑیل جوان کا
تڑپے اُٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر
چلّاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہی کہ رات ہی
دیکھو حرم سرا سے سکینہ نکل نہ آئے
اکبر اُجڑ گیا مرا گھر ہائے ہائے
سر پیٹتا چلوں گا مرے ہاتھ چھوڑ دو
یومِ وفاتِ حضرتِ شبّر ہی ای پسر
صبر اب کہاں یہ داغِ برادر ہی ای پسر
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھیے
سیدھی نہ ہوگی اب یہ کمر ہائے ہائے
کاٹا گیا چھری سے جگر ہائے ہائے
محسن ہوا شہید حسن آج مر گئے
دل کو ذرا سنبھالیے یا شاہِ بحر و بر
گھبرائیے نہ اب ہی ترائی قریب تر
چلیے حرم میں لیکے بہشتی کی لاش کو

جس دم قریب لاش کے لائے حسین کو
تڑپا وہ شیر سن کے صدائے حسین کو
ڈوکوہ غم کے دل پہ جو اک بار گر پڑے
بھائی کی لاش بھائی نے دیکھی جو خوں میں تر
بولے یہ آنکھیں کھول کے عباسِ نامور
صدقے ہزار جان امامِ غیور کے

منہ مَل کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال
ای میرے بھائی جان کہو اپنے دل کا حال
آرام آگیا تپشِ روح و دل گئی
مولا نزولِ رحمتِ پروردگار ہی
شبر کھڑے ہیں راہ میں چشم اشکبار ہی
قدسی قطار باندھے ہیں ناقوں پہ نور کے

کیا بندہ پروری ہی زہے عز و افتخار
تھم تھم کے جسم سے جو نکلتی ہی جانِ زار
کیونکر نہ ایسی مرگ پہ نازاں غلام ہو
رونے لگے یہ کہہ کے جو عباسِ ذی وقار
کی عرض اب بدن سے نکلتی ہی جانِ زار
تلواریں کھینچ کھینچ کے لشکر جو آئے گا

کیا بے بسی ہی موت سے ای قبلۂ انام
بگڑا ہی دم کی آمد و شد کا بھی انتظام
پاؤں گا اب کہاں میں امامِ غیور کو

عباس جاں بلب نظر آئے حسین کو
اکبر نے ہاتھ اُٹھا کے دکھائے حسین کو
پہلو میں لاش کے شہِ ابرار گر پڑے
اُڑا یہ دل کہ منہ کے قریب آگیا جگر
اکبر سنبھالو قبلۂ عالم کو بیٹھ کر
مجھ کو اُٹھا کے گرد پھراؤ حضور کے

عباس تم کو نزع میں بھی ہی مرا خیال
صفدر نے مسکرا کے کہا تکیۂ ذوالجلال
آپ آئے کیا کہ دولتِ کونین مل گئی
اب آمد آمدِ شہِ دُلدل سوار ہی
شاید جنابِ فاطمہؑ کا انتظار ہی
آتے ہیں باغِ خلد سے نانا حضور کے

لاکھوں برس کی زیست ہی اس موت کے نثار
دشوار ہی مفارقتِ شاہِ نامدار
ہنگامِ نزع جس کے سرہانے امام ہو
فرمایا شہ نے روتے ہو کیوں تم پہ میں نثار
غم ہی کہ آپ اکیلے ہیں یا شاہِ نامدار
اب کون ہی جو قبلۂ دیں کو بچائے گا

باتیں تو بھیں بہت پہ نہیں طاقتِ کلام
کچھ ایسی آبنی ہی کہ مجبور ہی غلام
جی چاہتا ہی یہ کہ نچھوڑوں حضور کو

گھبرا کے نزع میں علی اکبر سے یہ کہا
میرا تو کوچ ہے طرفِ گلشن بقا
گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو
یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھا یا سر
ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے ادھر ادھر
من کا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں

چلائے سر کو پیٹ کے سلطانِ بحر و بر
بیکس ہوا حسین لٹی دولتِ پدر
فرزند تھا مرا یہ تمھارا غلام تھا
یہ سب شرف ہے تیری غلامی کا ای پسر
جعفر بھی ہیں عقیل و حسن بھی ہیں نوحہ گر
پرسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں

اٹھ کر پکارے حضرتِ شبیرِ نامدار
ہے ہے مرا شفیق مرا یار و غمگسار
بھائی کا کیا سفر ہوا میں آپ مر گیا
بازو شکستہ ہو گیا ٹوٹی کمر مری
اب بے خبر ہیں کون رکھے گا خبر مری
کیوں مجھ سے منہ پھرا لیا تقصیر کیا ہوئی

یہ کہہ کے گر پڑے شہِ والا برسرِ خاک
بیٹا تڑپ گیا کہ پدر ہو گئے ہلاک
تیور جو آئے گر کے شہِ مشرقین کو

ای شاہزادۂ دو جہاں میں ترے فدا
فرزندِ فاطمہ سے خبردار اک ذرا
عمو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو
کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر
کس یاس سے حسین پہ کی آخری نظر
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں

فریاد ہے کہ مر گئے عباسِ نامور
آئی صدا علی کی کہ شبیر صبر کر
جو حال ہو چکا ہے کہ پیارا غلام تھا
زہرا سرہانے لاش کے روتی ہے ننگے سر
نانا تمھارے روتے ہیں تھامے ہوئے جگر
یہ سب تمھارے بھائی کے لینے کو آئے ہیں

میں لٹ گیا دوہائی ہے یا ربِ کردگار
خدمت گزار عاشقِ صادق وفا شعار
بچے مرے یتیم ہوئے باپ مر گیا
آنکھیں ادھر تھیں اس کی جدھر تھی نظر مری
واحسرتا زرہ مری ہے ہے سپر مری
سب جس سے کانپتے تھے وہ شمشیر کیا ہوئی

تر ہو گئی شہید کے خوں سے قبائے پاک
کر ڈالا دستِ غم سے گریبان چاک چاک
چلائی فاطمہ کہ سنبھالو حسین کو

جلدی عبا اُٹھا کے دلاور کی لاش پہ
خیمے سے نکلی آتی ہیں رانڈیں برہنہ سر
آیا وہ گر تو ساتھ سکینہ بھی آئے گی
فرمایا شہ نے آپ کا مطلب ہی اس سے کیا
مجھ سے ابھی تو بچھڑے ہیں عباسِ باوفا
ہے ہے ابھی سے رشتۂ اُلفت کو توڑ دوں
آواز پھر علی کی یہ آئی کہ ای پسر
ڈیوڑھی پہ غش ہی زوجۂ عباسِ نامور
صدمے جہاں میں بے پدری کے عظیم ہیں
ناچار لاش چھوڑ کے اُٹھے امامِ دیں
کوتل تھا ساتھ اسپِ علمدارِ مہ جبیں
لٹکی ہوئی تھی تیغ و سپر بھی دلیر کی
ماتھا لہو سے ڈوبا ہوا تھو تھنی فگار
گردن پھرا کے تکتا تھا دریا کو بار بار
خادم برہنہ سر لیئے آتا ہی اس طرح
صدمے سے تھی علم کی بھی ٹوٹی ہوئی کمر
پرچم پہ یوں جھکا ہوا پنجہ تھا خوں میں تر
پیدا تھی ہر قدم پہ علامت نشان سے
پہونچے حسین خیمۂ اقدس کے جب قریب
دوڑا تڑپ کے دلبرِ عباسِ مہ جبیں
کوتل ہی کیوں فرس مرے بابا کا دھر گئے

اکبر نے عرض شاہ سے کی ہاتھ جوڑ کر
تنہا کھڑا ہی راہ میں عباس کا پسر
دیکھی چچا کی لاش تو جیتی نہ جائے گی
روئیے نہ پیار سے بھائی کو مظلوم کربلا
راحت ہو شمر آکے جو کاٹے مرا گلا
کس پر ہیں ان کی لاش کو جنگل میں چھوڑ دوں
تو جا کہ میں تو ہوں ترے بھائی کی لاش پر
دونوں غلام زادے تمھارے ہیں نوحہ گر
اک سوگوار رانڈ ہی اور دو یتیم ہیں
مشک و علم کو لیکے چلے اکبرِ حزیں
باگیں کٹی تھیں تیغوں سے ڈھلکا ہوا تھا زیں
پرخوں زرہ سمند پہ رکھی تھی شیر کی
سینہ بھی سب چھنا ہوا گردن بھی زخمدار
یعنی پڑا ہی دشت میں تنہا مرا سوار
دُلدل کو لوگ لاتے ہیں مجلس میں جس طرح
چھینٹیں تھیں خوں کی سبز پھریرے پہ سربسر
جس طرح پیٹتا ہی کوئی سوگوار سر
پیٹو کہ اُٹھ گیا مرا حالی جہان سے
آگے بڑھے جھکا کے علم اکبرِ حزیں
چلایا کیا غضب یہ ہوا بابا امامِ دیں
سر پیٹ کر حسین پکارے کہ مر گئے

یہ سُن کے سُن گئے پاؤں پھرا وہ جگر فگار
مادر پکاری خیر تو ہے تم پہ میں نثار
پانی کو جو سدھارے تھے وہ خوں میں تر ہوئے
پردا اُلٹ کے خیمے کا فضّہ نے دی صدا
لاتے ہیں گھر میں مشک و علم شاہِ کربلا
موت آئی ان کو پیاسوں کی تقدیر سو گئی
خیمے میں حشر ہو گیا سُنتے ہی یہ خبر
ماتم کی صف پہ بیٹھ گئی کوئی نوحہ گر
ہی ہی کا غل ہوا کہ سکینہ اُچھل پڑی
اکبر نے آکے گاڑ دیا صحن میں علم
حضرت پکارے پیٹ گئے زانو پدر و غم
جیتے رہے تھے اس الم و یاس کے لیئے
برپا ہوا یہ حشر کہ ہی ہی علی کے لال
پیٹی پچھاڑیں کھا کے جو بانوے خوش خصال
فق ہو گیا سکینہ کا مُنہ سانس اُلٹ گئی
مُنہ دامنِ علم سے چھپائے بصد بکا
اس خوں بھرے علم کے میں قربان ہیں فدا
بابا اکیلے ہو گئے آفت گزر گئی
اللہ رے دلخراشی علی کی بہو کے بین
چادر پڑی تھی منہ پہ کہ تھے سامنے حسین
ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے

آیا حرم میں مضطر و نالان و بے قرار
چلایا چاک کر کے گریباں وہ سوگوار
امّاں اُڑاؤ خاک کہ ہم بے پدر ہوئے
اے پردے والو ڈیوڑھی سے ہٹ جاؤ اک ذرا
مارے گئے جہاد میں عباسِ باوفا
ہائے ہائے علی کی چھوٹی بہو رانڈ ہو گئی
رانڈوں کے دل الٹ گئے تھرا گئے جگر
غش کھا کے گر پڑی کوئی کھولا کسی نے سر
حجلے سے بال کھولے دُلھن بھی نکل پڑی
کھولے سروں کو زیرِ علم آئے سب حرم
لو زینب اپنے بھائی کو رو آئے رن میں ہم
رنڈسالہ لاؤ زوجۂ عباس کے لیئے
بکھرا دیئے حسین کی بہنوں نے سر کے بال
مٹی پہ لوٹنے لگے اطفالِ خردسال
پھیلا کے ننھے ہاتھ علم سے لپٹ گئی
چلّاتی تھی کدھر گئے ہی ہی مرے چچا
مشکیزہ کیوں دیا تھا یہ سب ہے مری خطا
ہی ہی یہ پانی مانگنے والی نہ مر گئی
سکّانِ آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین
تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین
حکمِ حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

کچھ سوچ کر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں
منہ کر کے سوئے نہر کا پری وہ دل حزیں
جنگل بسا دیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب سکینہ جان بلکتی ہیں آئیے
صدقے گئی بھتیجی کو پانی پلائیے
اُلفت کے دلدہی کے منافی نہ چاہیئے
کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں
جان علی ہیں آپ تو میں جان نثار ہوں
جنگل میں چھوڑیئے نہ مجھے ہاتھ تھام کے
والی کہاں یہ رانڈ یتیموں کو لیکے جائے
اب گھر سے کام کیا جو رضا سوگوار پائے
کیا اُس کی زندگی جسے وارث سے یاس ہو
ہی ہی علم کے ملنے کی شادی کہوں ہیں کیا
باہر سے پہلے آکے مرے پاس یہ کہا
صدقے سے شہ کے جعفرِ طیار ہم ہوئے
میں نے بلائیں لیکے پیارا ز تہنیت کہا
سردار فیض بخش علمدار باوفا
کیا کیا نوازشیں ہیں امامِ غیور کی
کہتے تھے شب کو بھر کے دمِ سرد دم بدم
سو سر خدا جو دے تو نثارِ شہِ اُمم
کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تیر ہیں

اُس وقت ہاتھ اُٹھا کے عَلَم کی بلائیں لیں
صاحب حسین روتے ہیں تم کو خبر نہیں
صاحب کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے
کانٹے زباں کے دیکھ کے آنسو بہائیے
قربان جاؤں مشک بھری ہو تو لائیے
صادق ہیں آپ وعدہ خلافی نہ چاہیئے
بیوہ ہوں جاں بلب ہوں غریب الدیار ہوں
ہاں ناز ہی تو یہ ہے کہ خدمت گزار ہوں
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے
اس کربلا نے لوٹ لیا مجھ کو ہائے ہائے
سر پیٹتی ہوئی لبِ دریا کنیز آئے
میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو
خضرا ان کو مل گئے عَلَمِ سبز کیا ملا
تھی جس کی آرزو ہمیں عہدہ وہی ملا
صاحب تمھیں خبر ہے علمدار ہم ہوئے
آقا کو اور تم کو سلامت رکھے خدا
بولے یہ سب حسین کی ہے شفقت و عطا
لے آؤ تم بھی جا کے بلائیں حضور کی
تم ہم کو چاہتی ہو تمھیں چاہتے ہیں ہم
گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا ہے الم
اس کا بھی غم بڑا ہے کہ بچے صغیر ہیں

کیسی یہ غفلت آج ہے ای شیرِ حق کے لال
بھاتی تھی جس کے بالوں کی بو آپ کو کمال
اب وصل کے نہ دن نہ شبیں اشتیاق کی
صاحب تمھیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
ہے ہے مرے نصیب کہ تم سے بچھڑ گئی
کن راحتوں میں تھی کہ مصیبت یہ پڑ گئی
کیا راہ و رسم ہے یہی دنیائے زشت ہیں
کیونکر کہوں کہ آپ میں مہر و وفا نہ تھی
اتنا گلہ ہے بس کہ یہ غفلت روا نہ تھی
بے وجہ خیر خواہ سے مونہہ موڑتے نہیں
یوں مونہہ کو موڑنا تو طریقِ وفا نہیں
کیونکر کٹے جہاز موافق ہوا نہیں
دیتی ہوں واسطہ میں شہِ مشرقین کا
صاحب تمھیں سکینۂ ناشاد کی قسم
تم کو حسینِ کشتۂ بیداد کی قسم
جب تم نہ ہو تو خاک ہے دنیائے زشت ہیں
یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی سر وہ سوگوار
بھاوج کے ہاتھ تھام کے بولے بحالِ زار
انجام کار سب کے لئے مرگ و گور ہے

بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہے خیال
اُس نے تمھارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال
کیونکر کٹیں گی دشت میں راتیں فراق کی
دریا کا قرب سرد ترائی خنک ہوا
بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے
غم ہے کہ کیوں نہ میں دمِ رخصت بگڑ گئی
والی مجھے بلاؤ کہ دنیا اُجڑ گئی
لونڈی تو قید خانہ میں صاحب بہشت میں
میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی
کیا پائینتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی
ساتھی بُرا بھی ہو تو اُسے چھوڑتے نہیں
صدقے گئی مرا تو کوئی آسرا نہیں
منجدھار میں تو ناؤ ہے اور ناخدا نہیں
والی مجھے نباہیے صدقہ حسین کا
صاحب تمھیں مصیبتِ سجّاد کی قسم
تم کو ہمارے نالہ و فریاد کی قسم
مجھ کو بھی اپنے پاس بُلا لو بہشت میں
ڈیوڑھی پہ آئے روتے ہوئے شاہِ نامدار
بس بس خدا کو یاد کرو اب اے جگر فگار
بی بی خدا سے کیا کسی بندے کا زور ہے

بس اے انیس طول کی آگے نہیں ہے تاب
طاری ہے ضعف دیتی ہے طاقت بھی اب جواب
بلواؤ خاکسار کو یا ابن بو تراب
ڈر ہے کہ ہند میں مری مٹی نہ ہو خراب
جلوہ رہے مزار پہ مولا کے نور کا
خاک شفا میں قبر ہو صدقہ حضور کا

رباعی

نا فہم سے کب داد سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے بوستان یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رباعی

چل جلد اگر قصد سفر رکھتا ہے
تو کچھ بھی مآل کی خبر رکھتا ہے
راحت دنیا میں کس نے پائی ہے
جو سر رکھتا ہے درد سر رکھتا ہے

مرثیہ (۱۱)

جس دم حسین دلبرِ شبرؑ کو رو چکے
غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے
پالا تھا جس کو اس مہِ انور کو رو چکے
صفدر کو تشنہ لب کو دلاور کو رو چکے
دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
ایک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں لب خشک رنگ زرد
سینے میں گاہ ہوک اٹھی گاہ دل میں درد
چھینٹیں قبا پہ خون کی تھیں گیسوؤں پہ گرد
خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد
غم تھا کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے
اب ہم سے دیکھئے کسے قسمت جدا کرے

بھرتے تھے آہِ سرد کبھی تھام کر جگر
روتے تھے گاہ زانوئے اقدس پہ رکھ کے سر
تکتے تھے مسکرا کے کبھی جانبِ پسر
کرتے تھے یاس سے کبھی عباس پر نظر
وہ نونہال اور یہ پھولے پھلے ہوئے
حضرت کی ایک گود کے دونوں پلے ہوئے

ماتم ادھر تھا فوج کے باجوں کی دھوم اُدھر
یاں بیکسی تھی فوجِ عدو کا ہجوم اُدھر
باہم تھے سرکشانِ رے و شام و روم اُدھر
زر بانٹتا تھا خود پسرِ سعدِ شوم اُدھر
ہر شخص نعمتوں سے اُدھر کامیاب تھا
گرمی میں تین روز سے یاں قحطِ آب تھا

عباس چاہتے تھے کہ پہلے ہوں میں نثار
اکبر کا عزم تھا کہ بس اب سر ہی تن پہ بار
بھائی کے غم میں روئیں نہ آقائے نامدار
عمو سے پہلے جائیں ہمیں بہرِ کارزار
جاتا ہے وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں
حضرت یہ چاہتے ہیں کہ دونوں جدا نہ ہوں

اٹھتا ہے اہلِ بیت سے جب شورِ العطش
شہ کہتے ہیں قریبِ ہلاکت ہیں فاقہ کش
کرتے ہیں عرض وہ کے علمدارِ ماہوش
شاید سکینہ جان کو پھر آگیا ہے غش
کس سے کہیں جو قلب پہ صدمے گزرتے ہیں
افسوس ہم تو جیتے ہیں معصوم مرتے ہیں

دیکھا ہے جب سے لاشۂ قاسم کو پائمال
گر قبلۂ امم سے ملے رخصتِ جدال
روکے غلام کو یہ کسی کا جگر نہیں
جائیں جدھر لہو کی اُدھر ندیاں بہائیں
کاٹے سروں کے ٹھوکریں اک اک قدم پہ کھائیں
چھوٹے نہ تیغ ہاتھ سے جب تک کہ دم رہے

شہ نے کہا کہ اس میں کسی کو ہے کیا کلام
بھائی مگر یہ غیظ و غضب کا نہیں مقام
پہلے مروں میں تم نہ اگر سدِ راہ ہو
بولے بہا کے اشک علمدار نامدار
یاں ایک شاہزادہ ہے اور ایک جاں نثار
دیکھیں تو آپ ان کے نشانوں کے اوج کو

شہ نے کہا انھیں بھی تو ہے شوق جنگ کا
اچھا جہاد کی علی اکبر کو دی رضا
کس منہ سے پاس جاؤں گا خیر الانام کے
بانو کی روح جسمِ شہِ بے وطن کی جان
چھوٹے بڑوں کی آنکھوں کا تارا بہن کی جان
اُس زندگی پہ خاک اگر ایک دم جئیں

شہ نے کہا کہ پھر مجھے کھانے دو تیغ و تیر
تم یادگارِ شیرِ خدا شاہِ قلعہ گیر
سمجھے ہو سہل تم مجھے مشکل ہے کیا کروں
چھریاں جگر پہ چلتی ہیں یا شاہِ خوش خصال
دشتِ نبرد کو ابھی کر دیں لہو سے لال
دریا نہ چھین لیں تو علی کے پسر نہیں

ظالم کسی پرے میں سلامت نظر نہ آئیں
مشکیزہ بھر نہ لیں تو نہ منہ آپ کو دکھائیں
چھاتی پہ مرتے وقت بھی مشک و علم رہے
تم غیظ میں جو آؤ تو ہل جائے روم و شام
میری تو یہ دعا ہے کہ ہو صابروں میں نام
مجھ کو نہیں قبول کہ امّت تباہ ہو

ہل من مبارز کی ہے اس فوج میں پکار
آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار
اتنا تو ہو کوئی کہ نہ بڑھنے دے فوج کو
غازی نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ کربلا
انصاف کیجیے مجھے خلقت کہے گی کیا
جب شاہزادہ قتل ہو آگے غلام کے

دنیا کی زیب آلِ رسولِ زمن کی جان
پامال ہو وہ گل جو ہے سارے چمن کی جان
ہم شکلِ مصطفےٰ تو نہ ہو اور ہم جئیں
تم سا جوان قتل ہو جیتا رہے یہ پیر
ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر
دو داغ اور ایک میرا دل ہے کیا کروں

تم ہو گے تو تباہ نہ ہوگا ہمارا گھر
عریاں نہ ہوں گے بلوے میں سیدانیوں کے سر
بچ جائیں گے سبھوں کے گلے ریسمان سے
کہنے لگے یہ رو کے علمدارِ ذی حشم
کرتے ہیں گر سپرد یہ عہدہ شہِ امم
نام و نشاں سے کام نہ دنیا سے کام ہے
سمعاً و طاعۃً ہمیں کیا آبرو سے کام
بہتر ہے بیڑیاں بھی پہن لے گا یہ غلام
آقا کریں عتاب نہ گر جاں نثار پر
رونے لگے یہ سن کے شہنشاہِ بحر و بر
سیدانیاں یہ کہنے لگیں تھام کر جگر
اکبر کی خیر ہو شہِ والا کی خیر ہو
سب بی بیاں تھیں گردِ علمدارِ نامدار
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ ذی وقار
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں چہرہ بھی لال ہے
لیکر بلائیں کہتی تھی بانوے شاہِ دیں
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ مہ جبیں
کرتا نہیں مدد کوئی لاکھ التجا کریں
بنتِ علی کے پاس جو پہونچا وہ سیم بر
گھبرا کے بولی زینبِ ناشاد و نوحہ گر
اب تو کوئی لڑے گا نہ بیکس امام سے

عابد کو بیڑیاں نہ پنہائیں گے اہلِ شر
زینب کو شام میں نہ پھرائیں گے در بدر
بُندے نہ پھر چھنیں گے سکینہ کے کان سے
میرا ہے افتخار نہ منصب نہ یہ حشم
بہتر ہے پھر کسی کو عنایت ہو یہ علم
مجھ کو رضائے سیدِ والا سے کام ہے
کچھ عرض کی مجال نہ تکرار کا مقام
کھولوں سلاحِ جنگ اجازت جو دیں امام
جا بیٹھوں منہ چھپا کے علی کے مزار پر
عباس آئے خیمہ کے اندر جھکائے سر
کیا ہے جو روتے آئے ہیں عباسِ نامور
یارب وطن میں فاطمہ صغرا کی خیر ہو
جو پوچھتا تھا اور یہ روتے تھے زار زار
صاحب کہو تو کچھ کہ میرا دل ہے بے قرار
مقتل میں کیا ہوا جو تمھارا یہ حال ہے
بھیا بتاؤ خیر سے ہیں اکبر حزیں
ہے خیریت حضور نہ گھبرائیں کچھ نہیں
جو بد نصیب ہوں وہ نہ روئیں تو کیا کریں
ماتم کی صف پہ رکھ دیئے ہتھیار کھول کر
عباس کیا ہے کھولتے ہو کس لئے کمر
کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

رونے کی وجہ کیا ہی سمجھتا ہی میرا دم
بہتے ہیں اشک نرگسی آنکھوں سے دم بدم
آخر کھلے گا سبب یہ کوئی واردات ہو

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش خصال
قسمیں جناب دیتی ہیں تم کو نہیں خیال
صدقہ انھیں کا سب ہی کہ پھولے پھلے ہو تم

قدموں پہ سر جھکا کے یہ عباس نے کہا
میرا کفیل کوئی نہیں آپ کے سوا
میرا نہیں خیال شہِ خاص و عام کو

فرماتے ہیں کہ اکبرِ مہرو وغا کو جائیں
دیکھیں انھیں شہید یہ دل ہم کہاں سے لائیں
کب اٹھ گئے جہاں سے کسی کو خبر نہ ہو

زینب نے تب کہا کہ یہ آزردگی ہی لو
کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا اذن دو
رونا ادھر ادھر کو غریبی و یاس ہی

مشکل مجھے ہی کس سے کہوں اپنا حالِ زار
بیکس بہن سے پوچھے کوئی بھائیوں کا پیار
کہتے ہیں موت خلق میں سب اس جدائی کو

زاری ادھر تھی اور پریشاں تھا سب کا حال
ہمشکل مصطفےٰ سے یہ بولا علی کا لال
بیتاب دل ہی چھاتی سے لپٹائیں بھائی کو

قاسم کے غم میں کیا ہوا کچھ اور تازہ غم
بولو تو کچھ حسین کے سر کی تمھیں قسم
مجھ سے الگ کہو جو چھپانے کی بات ہو

وہ کونسی ہی بات کہ جس کا ہی یہ ملال
صاحب بڑی بہن سے کہو اپنے دل کا حال
بیٹوں کی طرح گود میں ان کی پلے ہو تم

کیونکر نہ روؤں قتل ہوئے خویش و اقربا
مجھ کو حسین مرنے کی دیتے نہیں رضا
دیجے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

بچے ہوں کامیاب شہادت ہمیں نہ پائیں
پردہ اسی میں اب ہی کہ عالم سے منہ چھپائیں
اس بن میں جا رہیں کہ بشر کا گزر نہ ہو

معلوم اب ہوا مجھے مطلب ہی ان کا جو
اچھا بلا کے کہتی ہوں آگے جو ہو سو ہو
ان کا بھی درد ہی مجھے ان کا بھی پاس ہی

وہ ماں کی جان و روح یہ بابا کی یادگار
کیونکر جئیں گے ہائے شہنشاہِ نامدار
یارب مفارقت نہ ہو بھائی سے بھائی کو

آیا ادھر حسین کو عباس کا خیال
آزردہ ہو گئے ہیں علمدارِ خوش خصال
آؤ حرم میں چل کے منا لائیں بھائی کو

اکبر کا ہاتھ تھام کے گھر میں حسین آئے
پھیلا کے ہاتھ لب پہ شہِ دیں سخن یہ لائے
تم تو عزیز ہو مجھے اس نورِ عین سے

عباس ہاتھ جوڑ کے بولے کہ کیا مجال
کیا ذکر ہے ملال کا اے فاطمہ کے لال
حضرت غلام کہہ کے پکاریں تو شاد ہوں

حضرت کے منہ کو دیکھ کے زینب نے یہ کہا
صدقے بہن ہو بھائی انھیں دیجئے رضا
مثلِ علی جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں

واں ہے وغا طلب سپہِ خانماں خراب
حضرت کے ڈر سے دے نہیں سکتے ہیں کچھ جواب
بگڑیں تو پھر بپا ہو قیامت جہان میں

اکبر کو آپ بھیجدیں گر سوئے فوجِ شام
مطلب یہ ہے کہ فوج پہ چمکے مری حسام
پہلے ہمیں حسین پہ سر کو فدا کریں

نیت سفر پہ باندھی ہے ہتھیار کھول کر
کیا آپ نے کہا تھا کہ اکبر کٹائے سر
میرے حواس ان کے تڑپنے نے کھوئے ہیں

کیونکر زباں سے اپنی کہوں میں جگر فگار
حضرت پہ ان کے دل کا تو مطلب ہے آشکار
صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں

دیکھا کھڑے ہیں حضرتِ عباس سر جھکائے
آؤ گلے لگو کہ دلِ زار چین پائے
کس بات پر خفا ہوئے بیکس حسین سے

ہیں شبیرِ کبریا کی جگہ شاہِ خوش خصال
عاجز ہوں شکر میں جو زباں سب ہوں تن کے بال
مادر مری کنیز ہے میں خانہ زاد ہوں

آپ ان پہ شیفتہ ہیں یہ ہیں آپ پر فدا
دُنیا میں اور بھی ہے کوئی ایسا باوفا
ظاہر ہے آپ پر کہ یہ نازک مزاج ہیں

ان کو کسی کی بات کے سُننے کی کب ہے تاب
غصہ بھی ہے اور یہی ان کو ہے پیچ و تاب
رونا یہ ہے کہ آتا ہے فرق آن بان میں

ہو جائیں دشمن ان کے تڑپ کر ابھی تمام
دنیا میں مجھ سے بڑھ کے نہ ہووے کسی کا نام
پالا ہے دکھ سے اب انھیں کیونکر جدا کریں

بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر
مجھ کو کبھی یقیں نہیں یا شاہِ بحر و بر
روئی ہوں میں بھی ساتھ یہ اس طرح روئے ہیں

ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذن کارزار
خیر اب خوشی انھیں کی کریں شاہِ نامدار
غصے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

شہ نے کہا کہ بس ہے اسی بات کا ملال
قسمت میں ہے کہ یہ بھی نہ ہو وقتِ انفعال
قاتل ہو زخمی چھاتی پہ خنجر ہو پیاس ہو
ہم چاہتے ہیں ساتھ جیئیں ساتھ ہی مریں
تلواریں کھا کے ایک جگہ خون میں بھریں
مشتاق ہیں بہشت کے حوروں کے قصر کے
سب اہلِ بیت رونے لگے سن کے یہ کلام
تقصیر بخشئے مری اے شاہِ تشنہ کام
بھائی سے دل برا کہیں ہوتا ہے بھائی کا
لائیں سلاح سامنے زینبؔ بچشمِ تر
تسلیم کی ادب سے جری نے جھکا کے سر
غم چھا گیا امید چلی یاس رہ گئی
لیکر علم ادھر سے بڑھا وہ فلک جناب
گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوے مثلِ آفتاب
اسوار بے نظیر فرس بے مثال تھا

مطلع

آمد علی کے شیر کی ہے رزم گاہ میں
ہر چند ابھی سوارِ صفدر ہے راہ میں
غل ہے وہ شیر قصد کیئے ہے ترائی کا
یوں چھیڑتے فرس کو اس آفت کے بن میں آئے
اس دبدبے سے لشکرِ پیماں شکن میں آئے
جنگل کے شیر صورتِ آہو دبک گئے

لیں اذنِ جنگ خیر سدھاریں پئے جدال
تنہا مسافرت میں رہے فاطمہ کا لال
کٹنے لگے جو حلق تو کوئی نہ پاس ہو
مرنے لگیں جو ہم تو یہ زانو پہ سر دھریں
خیران کی جو خوشی یہی پہلے سفر کریں
یہ قبلِ ظہر پہونچیں گے ہم بعد عصر کے
قدموں پہ شہ کے جھک کے یہ بولا وہ نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے یہ کہنے لگے امام
یہ روٹھنا فقط تھا بہانہ جدائی کا
پٹکا اٹھا کے شہ نے کہا باندھیئے کمر
ہتھیار سج کے خیمہ سے نکلا وہ نامور
بس سر جھکا کے زوجۂ عباس رہ گئی
خادم ادھر سے لائے فرس کو بصد شتاب
نورِ قدم سے چاند بنے حلقۂ رکاب
جو نعل کا نشاں تھا زمیں پر ہلال تھا
دہشت سے تہلکہ ہے عدو کی سپاہ میں
بجلی چمک رہی ہے عدو کی نگاہ میں
پھر معرکہ ہے آج علی کی لڑائی کا
جیسے نسیمِ فصلِ بہاری چمن میں آئے
اک شور پڑ گیا اسد اللہ رن میں آئے
جتنے بڑھے ہوئے تھے بپے سب ہمک گئے

اللہ رے رعبِ حضرتِ عباسِ عرش جاہ
دیکھا جدھر تو سکا، یہ کی شیر نے نگاہ
کھایا نگہ کا تیر اگر آنکھ چار کی
کاندھے پہ ساتھ مشک و علم پشت پر سپر
وہ تیر الحفیظ کماں وہ کہ الحذر
وہ ڈھال روک لے جو تہمتن کے وار کو

سر پر وہ خود گرد ھپرے جس کے آفتاب
بیت ابروؤں کی حسن کے دیواں میں لا جواب
مر جائے شیر پر جو پڑے اُس ولی کی آنکھ
قرآن و رحل روئے مبین و خطِ سیاہ
سوکھے لبوں پہ برگِ گلِ تر کا اشتباہ
ایسا دقیق اور معمّا کہیں نہیں

کیونکر کہیں کہ غنچۂ تصویر وردہ ہی
کس طرح منقسم ہو وہ جوہر جو فرد ہی
میزانِ عقل میں حکما کے تلا نہیں
دانتوں میں وہ چمک کہ نظر کو نہیں ہی تاب
کیا ان کے سامنے گُہرِ بے بہا کی آب
گر منہ سے دُر کہوں تو فصاحت سے دور ہی

شانوں کو آفتاب اگر کیجیے رقم
لوکاٹتا ہی غیظ سے اپنی زباں قلم
کون ایسا نوجواں تھا خدا کے ولی کے بعد

صف پر گریں صفیں تہ و بالا ہوئی سپاہ
ہٹ ہٹ گئے جو نہر کو روکے تھے روسیاہ
دکھلا دی ابروؤں نے برش ذوالفقار کی
وہ تیغِ تیز دم میں جگر کردے مہم کو سر
وہ ضربِ گرز توڑ دے جو کوہ کی کمر
نیزہ وہ جو فرس سے اُٹھا لے سوار کو

نورِ جبیں سے بدرِ فلک قدر کو حجاب
جو خالِ مشکبیز کا نقطہ وہ انتخاب
آنکھوں کو دیکھیے تو بعینہٖ علی کی آنکھ
ظلمت میں آفتاب ہی یا جوفِ شب میں ماہ
مدحِ دہن میں اب نہیں ملتی سخن کو راہ
موجود اسم ہی پہ مسمّا کہیں نہیں

یاں یاسمن بھی فرطِ خجالت سے زرد ہی
حیراں خیالِ فلسفیِ ہرزہ گرد ہی
یہ وہ طلسم ہی جو کسی سے کھلا نہیں
خود جس کی برق و شرق سے آکاش کو حجاب
دعویٰ ہو کچھ تو دوں ابھی دنداں شکن جواب
دانا کو آبرو کی حفاظت ضرور ہی

ذرّے سے آفتاب جہاں تاب یاں ہی کم
یہ وہ ہی جس پہ فوجِ خدا کا رہا عَلَم
بے شک علم انھیں کے لئے تھا علی کے بعد

شانے وہ گول گول وہ بازو بھرے بھرے
پہنچوں کے زور سے تہہ و بالا ہوئے پرے
ضو ان ہتھیلیوں کی کہاں آفتاب میں
سینہ وہ آئنہ ہے کہ صدق و صفا کا گھر
سینے میں اس طرح ہے دلِ باوفا کا گھر
کعبہ ہے گو زمیں پہ مگر عرش قدر ہے
قربان ہیں ثباتِ قدم پر ہزار سر
اعدا جو لاکھ ہوں تو کریں ایک بار سر
نقش اس قدم کا خاک پہ رہتا ہے اس طرح
ناگہہ صدا بلند ہوئی طبلِ جنگ کی
نکلے نقیب اور یہ صدا بے درنگ کی
نامی جوان وہ ہے جو لڑے اس دلیر سے
جب یوں بڑھا یہ دل تو سواروں کے دل بڑھے
ہر صف سے یوں اڑے ہوئے تیغوں کے پھل بڑھے
تنہا تھا وہ صفیں تھیں بہم جس کے واسطے
الٹی علی کے شیر نے بھی آستیں ادھر
ظاہر ہوا جلالِ جہاں آفریں ادھر
صف پر جو صف گری تو پیادے سوار پہ
یوں تیغ شعلہ زا نکل آئی نیام سے
جس طرح برق ابر سے معنی کلام سے
آئینہ ظفر تھا کہ نکلا غلاف سے

فرقت میں جن کی حور نہ تکیہ پہ سر دھرے
پنجہ وہ جس کو دیکھ کے شیرِ ژیاں ڈرے
وہ اُنگلیاں و رائیں جو خیبر کے باب میں
مسکن ادب کا علم کا ماخذ حیا کا گھر
جس طرح سب گھروں میں مقدس خدا کا گھر
دل صدر میں ہے صدر جہاں ہے وہ صدر ہے
رکھتا ہے فخر جس پہ بصد افتخار سر
سرکیں نہ اور کٹ کے گریں بے شمار سر
مٹتا نہیں کبھی خطِ تقدیر جس طرح
جو تھے بہادر اُن کے دلوں نے اُمنگ کی
باگیں اُٹھا دو اسپ کمیت و سرنگ کی
اب سامنا ہے شیرِ الٰہی کے شیر سے
گرز اپنے تول تول کے لشکر کے یل بڑھے
جس طرح قبضِ روح کو دستِ اجل بڑھے
یہ معرکہ تھا اک متنفس کے واسطے
قبضے پہ ہاتھ اُدھر گیا کانپے زمیں ادھر
آیا جلال میں اسدِ خشمگیں ادھر
گویا علی نے ہاتھ رکھا ذوالفقار پر
نکلی بیاضِ صبح شبِ تیرہ فام سے
چہرہ دکھایا حور نے دارالسلام سے
کھینچا پری کو فخرِ سلیماں نے قاف سے

چمکی جو تیغ برقِ جہندہ بنا سمند
آہو جو خاک پر تو ہوا کی طرف پرند
خود آگ تھا وہ رخش تو سیماب جوڑ بند
اسوار کو چھپا لے وغا میں وہ سربلند
ہر نعل و سم کو فوق تھا بدر و ہلال پر
طاؤس و کبک جد میں تھے اُس کی چال پر

گھوڑا کہیں پرند کسی جا پری کہیں
آہو کہیں ہما کہیں کبک دری کہیں
تیروں نے اُس سے رَوِش کی ہمسری کہیں
نرمی کہیں شتاب کہیں صفدری کہیں
رکھتا تھا معرکہ میں قدم اس وقار سے
جیسے چمن میں پھول گرے شاخسار سے

کلکِ اس کے ہاتھ پاؤں کو لکھے تو کیا لکھے
مردم ہوا پرست کہیں گر ہوا لکھے
خو بے سعادتی ہے جو بالِ ہما لکھے
مشہور نارسا ہو جو ذہنِ رسا لکھے
ناقص کہیں جو طالبِ تشبیہ تام ہیں
یہ سب اُسی کے غاشیہ داروں کے نام ہیں

پریاں نثار ہوتی ہیں چال اُس کی دیکھیے
حوروں کے بال دیکھ کے یال اُس کی دیکھیے
سرعت و رم جدال و قتال اُس کی دیکھیے
کیا حسن ہے رکاب و دوال اس کی دیکھیے
روشن ہیں پتلیاں کہ قدم اس جری کے ہیں
آنکھیں یہ حور کی ہیں وہ گیسو پری کے ہیں

آغازِ جنگ میں وہ تگ و دو وہ آؤ جاؤ
گھونگھٹ نیا تھا چال نئی تھی نیا بناؤ
جاتا تھا یوں اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ
جیسے ہوا میں جاتی ہے آبِ رواں پہ ناؤ
تھا صاحبِ عَلَم بھی جدل پر تُلا ہوا
کشتی کا بادباں تھا پھریرا کھلا ہوا

ڈھالوں کو روکتے تھے جوانانِ پُر جگر
بجلی گری پڑے گی تو پھر کیا کرے بشر
وہ اُڑ گئیں کلائیاں دھڑ سے گرا وہ سر
بازو ہوا وہ قطع وہ دو ہو گئی کمر
وہ آتشِ فساد و غضب خاک ہو گئی
سینہ وہ کٹ گیا وہ زرہ چاک ہو گئی

جب حسن سے وہ چلی تو گرے سر زمین پر
سر تھے کسی جگہ کہیں پیکر زمین پر
وہ تیغ دم نہ لے کہیں دم بھر زمین پر
جبریل بھی بچھائیں اگر پر زمین پر
فتح و ظفر حسامِ دو دستی کے ساتھ ہے
دستِ خدا کے جوشنِ بازو کا ہاتھ ہے

وہ برق جب ادھر سے ادھر جاکے پھر گئی
بے جان اسے کیا اُسے تڑپا کے پھر گئی
چڑھتے ہی رن پہ نشۂ جرات اتر گئے
یوں تھیں صفیں کہ موج کے پیچھے ہو جیسے موج
چکر میں تھی بصورتِ گرداب ساری فوج
بیدم ہیں وہ جو تیغ دو دم سے دو چار ہیں
غصہ ستم تھا قہر غضب تھا جفا نئی
مضمون نئے ہیں بندشِ مہر و وفا نئی
جیسے ورق ہوا سے پرے یوں اُلٹتے ہیں
فوجوں میں ابتری تھی علی کے طفیل سے
جوہر کہیں فزوں تھے ضیا میں سہیل سے
نازل تھا قہر منزلِ ہستی خراب تھی
اعدا کے حق میں ہو گیا آب حسام سم
نیزے تھے خوف سے صفتِ چوبِ خام خم
دشمن بھی معترف تھے وہ پیکار کر گئے
اک آگ تھے کہ خاک میں سب کو ملا گئے
آئے جدھر زمین کے طبقے ہلا گئے
تیروں کو بلبلوں کا نشیمن بنا دیا
رہوار پھر رہا تھا طرارے ادھر اُدھر
اُڑتے تھے اُس کے دم سے شرارے ادھر اُدھر
دریا پہ ہاتھ دھوئے تھے سب اپنی جان سے

خوں پی کے سر گرا کے صفیں کھا کے پھر گئی
تھی اک چھری کہ حلق پہ اعدا کے پھر گئی
دیکھا نہ صاف منہ اسی حسرت میں مر گئے
تھا دم بدم شناورِ دریائے خوں کو اوج
تلوار فرد فرد کو کرتی تھی زوج زوج
گر چار ہیں تو آٹھ جو دو ہیں تو چار ہیں
اڑتے تھے سر تنوں سے چلی تھی ہوا نئی
تیزی نئی ہے چال نئی ہے ادا نئی
سو سو گلے اشارۂ ابرو میں کٹتے ہیں
سیفی سے صاف تیز دعائے کمیل سے
ہاتھوں بڑھی ہوئی تھی روانی میں سیل سے
گھر گر رہے تھے کفر کی بستی خراب تھی
کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
مقتل سے اڑکے تا سرِ کہسار سر گئے
سم ہو گیا اُسے جسے پانی پلا گئے
زخموں کے پھول نخلِ بدن پر کھلا گئے
رن کی زمینِ شور کو گلشن بنا دیا
سب بھاگتے تھے خوف کے مارے ادھر اُدھر
دنبالہ دار گرتے تھے تارے ادھر اُدھر
تلوار کیا برستی تھی آگ آسمان سے

شمشیر زن کے ہاتھ میں دستِ خدا کا زور — پہونچا تھا ہاتھوں ہاتھ جسے مرتضےٰ کا زور
کس بل غضب کا قہر کی ضربت بلا کا زور — نعرہ یہ تھا کہ مجھ میں ہے مشکل کشا کا زور
مرحب سا اتنی فوج میں اک نامور نہیں — کیونکہ کھلے یہ زور کہ خیبر کا در نہیں

حسرت رہی وغا کی دلِ حق پسند کو — کھولا نہ ایک نے مرے نیزہ کے بند کو
پستی میں لاؤں اوج سے کس سربلند کو — خندق میں عمر ہو تو اڑاؤں سمند کو
دو ٹکڑے کردوں رستم و دستاں سے گیو کے — پٹکے سے باندھوں مثلِ علی ہاتھ دیو کے

جم کر لڑو صفوں کی صفائی تو دیکھ لو — گردن کی اور سروں کی جدائی تو دیکھ لو
ابنِ علی کی قلعہ کشائی تو دیکھ لو — پیاسے مسافروں کی لڑائی تو دیکھ لو
سرسبز ہوں میں تیغِ دو دم سرخرو رہے — تم کو ہوس رہے نہ مجھے آرزو رہے

ہر بار رن پہ رن پڑے ایسی نبرد ہو — ہنگامہ گرم ہو کے نہ بازار سرد ہو
تھرّائے آسمان رُخِ خورشید زرد ہو — بڑھنے نہ دو مجھے تو یہ جانوں کہ مرد ہو
بالائے دوش مشک ہے تلوار ہاتھ میں — دریا کا گھاٹ لیتا ہوں دو چار ہاتھ میں

یہ سُن کے واں کی فوج سے اک پہلوان بڑھا — گویا کہ جھومتا ہوا پیلِ دماں بڑھا
نیزہ بڑھا اُدھر سے ادھر سے نشان بڑھا — پنجہ اٹھا کے صید پہ شیرِ ژیاں بڑھا
دیکھا جو نعرہ مار کے اُس بد خصال کو — سمجھے یہ سب اسد نے دبوچا غزال کو

نیزہ اِدھر اُدھر سے بصد کرّ و فر تلا — باندھا اُدھر جو بند شقی نے اِدھر کھلا
ہوتا ہے کیا ہزار کرے فوج غلغلہ — یہ موجِ بحرِ قہر وہ پانی کا بلبلہ
تھی چوٹ پر جو چوٹ تکاں پر تکان تھی — نیزہ میں نوک تھی نہ کلائی میں جان تھی

جوڑا بچا کے سر کو ستمگر نے نہ سے تیر — تھرّا رہا تھا شورِ بگیر و بدہ سے تیر
زخمی ہوا نہ صدر نہ گزرا زرہ سے تیر — گوشے کماں کے کٹ گئے ٹوٹا گرہ سے تیر
سرزد خطا یہ کیا ہوئی ششدر شریر تھا — اوچھے سے وار میں نہ کماں تھی نہ تیر تھا

ظالم پکارا تول کے پھر گرز گاؤ سر
ممکن نہیں کہ خاک پہ گر کر اٹھا دو سر
رستم سا پہلواں ہو تو جی اس کا چھوٹ جائے
عباس نے کہا کہ خموش او زباں دراز
اللہ خاکسار کو کرتا ہے سرفراز
برہم اگر ہوں لال شہ قلعہ گیر کے
بے شرم راست بازوں سے یہ کج ادائیاں
نیکوں سے یہ بدی یہ بھلوں سے برائیاں
فیض و دیکھ کے بیشۂ حیدر میں آتے ہیں
مارا جھپٹ کے گرزِ گراں روسیاہ نے
پکڑی کلائی ہاتھ سے بازوئے شاہ نے
نقصانِ جاں بھی دست درازی کے ساتھ ہو
جب کھٹ کے انگلیوں سے ٹپکنے لگا لہو
بولے یہ ہاتھ چھوڑ کے عباسِ نیک خو
تو ہاتھ جوڑتا ہے تو منہ موڑتا ہوں میں
یہ گھاٹ چھین کر ہمیں بھرنی ہے مشکِ آب
تلوار جلد کھینچ لے او خانماں خراب
مشکلکشا کی تیغ کا یہ فیض عام ہے
جب اس طرح سے چل گئے تیغِ زباں کے وار
رد کر کے چند وار صدا دی کہ ہوشیار
سب غول چار آئنہ والوں کا دنگ تھا

اس کی ہوا لگے تو سلامت نبا دو سر
ہاں نورِ چشمِ حیدرِ صفدر بچا دو سر
ایک اس کی ضرب میں کمرِ کوہ ٹوٹ جائے
گو میں ضعیف ہوں پہ توانا ہے کارساز
کیا گرز گاؤ سر کی حقیقت ہے او گراز
پھینکیں زمیں پہ کلۂ اژدر کو چیر کے
کیا تجھ سے گاؤ زور سے زور آزمائیاں
ہم توڑ ڈالتے ہیں اسد کی کلائیاں
یاں کے غزال شیر کو آنکھیں دکھاتے ہیں
روکا سپر پہ ضرب کو اس دیں پناہ نے
چھوٹی نہ لاکھ زور کیا روسیاہ نے
چھوڑے نہ گرز کو تو نہ بازو نہ ہاتھ ہو
پہونچا ستم گر کو میں یہ پکارا وہ کینہ جو
پھر کیجیو نہ لاف زنی میرے روبرو
صیدِ زبوں سمجھ کے تجھے چھوڑتا ہوں میں
تڑپا رہا ہے قلب کو بچوں کا اضطراب
رکتا ہے کیوں لڑائی کا ہو فیصلہ شتاب
جب چار ہاتھ چل گئی قصہ تمام ہے
تیغِ دو دم کو تول کے آیا وہ نابکار
شمشیر سر پہ آئی کہ مرحب پہ ذوالفقار
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ تنگ تھا

ڈو ہو کے منہ کے بھل جو گرا وہ ستم شعار
بس سرنگوں گیا سوئے دوزخ وہ نابکار
گو آپ کی بھی تیغ میں آفت کا کاٹ ہے
غازی پکارا بڑھ کے ہمارے قدم ہٹیں
ممکن نہیں کہ صاحبِ سیف و قلم ہٹیں
مر کے نہیں قدم کبھی آگے بڑھے ہوئے
دریا یہ کیا ہے اور تمھاری بساط کیا
یہ گھاٹ کیا ہے قصر ہو تو کیا رباط کیا
اڑنے کو پر ملیں گے اگر تیر کھائیں گے
رکھیں گے تیغِ تیز کے قبضے پہ ہاتھ جب
دریا ہے جن کے جد کا وہ بچے ہیں تشنہ لب
ہتھیار کیا ہیں فوج کے جی چھوٹ جائیں گے
اعدا جمے سنبھال کے ہتھیار گھاٹ پر
آئی چمک کے برقِ شرربار گھاٹ پر
اعدا ہزار ڈھالوں میں منہ کو چھپاتے تھے
جھپٹے مثالِ شیر جدھر صف الٹ گئی
جو فوج مثلِ موج بڑھی تھی وہ ہٹ گئی
اللہ کا غضب تھا کہ تلوار ہاتھ میں
بجلی تھی یا کہ تیغ کا پرتو ادھر ادھر
چلتے تھے تھم کے وقتِ نگشتہ ادھر ادھر
عنصر بھی تھے شریکِ دمِ تیغ لاگ میں

عباس سوئے نہر بڑھے بہر کارزار
نیزے اٹھا اٹھا کے یہ کہنے لگے سوار
بڑھیے ذرا سنبھل کے یہ تیغوں کا گھاٹ ہے
تیغیں ہٹیں نشاں ہوں سلامی علم ہٹیں
دریا سے تم ہٹو یہ نہ ہوگا کہ ہم ہٹیں
اترے ہیں شیرِ ببر کے دریا چڑھے ہوئے
ثابت قدم کو تیغوں کا ڈر کیا صراط کیا
جب جان دی تو جسم کی پھر احتیاط کیا
کوثر پہ اب تو ہم ابھی دریا سے جائیں گے
کھل جائے گا اشارے میں یہ بند و بست سب
سر لوٹتے پھریں گے جو ٹوکا کسی نے اب
یہ مورچے بندھے ہوئے سب ٹوٹ جائیں گے
ڈھالیں نہ تھیں گھٹا تھی دھواں دھار گھاٹ پر
چلنے لگی دلیر سے تلوار گھاٹ پر
کیا وار تھا کہ نار میں سر اڑ کے جاتے تھے
یہ ہاتھ تن سے اڑ گیا وہ ڈھال کٹ گئی
دیکھا جو گھاٹ تیغ کا جرأت بھی گھٹ گئی
دریا کا گھاٹ لے لیا دو چار ہاتھ میں
ہر کہ سوار گرتے تھے سو سو ادھر ادھر
ہل چل تھی بیچ میں تو رَوارَو ادھر ادھر
پھینکا ہوا نے خاک میں پانی نے آگ میں

ہر بار اُڑ کے جاتا تھا چاروں طرف سمند
گھوڑوں سے گر کے پست ہوئے کتنے سربلند
صف پر گری تھی صف تو پرے بھی پرے تو تھے
اللہ ری سمند کی چھل بل لڑائی میں
بجلی تھی یا چمکتی تھی ہیکل لڑائی میں
بھاگڑ میں شہسواروں کی رہوار چھٹ گئے

جب جس سے تیغِ تیز چلی سر پہ سر گرا
بھائی پہ بھائی باپ پہ مر کر پسر گرا
کشتوں کے پشتے ہو گئے ضربِ دلیر سے
بجلی تھی سر پہ یا چمک اس شعلہ ریز کی
زہرے تھے آب تاب کسے تھی ستیز کی
ہٹ کر نہ شکلِ امن نہ بڑھ کر نجات تھی

ساحل پہ تیغ تول کے گونجا وہ شیرِ نر
توڑا ہی ایک ہاتھ سے خیبر کا ہم نے در
ہم سے مقابلہ تھا اسی کائنات پر
جن کو نہ دو دو دن ہو بہم قوتِ لایموت
زرہیں تھیں یا کہ موم کچھ ابتک نہیں ثبوت
ثابت نہیں خیار تھے یہ یا عمود تھے

تیغوں نے کچھ نہ کاٹ دکھایا نہ کس بل
پُرزے کہاں ہیں اُن کے جو ڈھالیں تھیں بدل
سر اُن کے کس طرف گو سنا نہیں کدھر گئیں

تلوار نے گریز کے کوچے کیئے تھے بند
دریا میں گر گے مر گئے کتنے جفا پسند
دو پاؤں تھے زمین پہ اور دو سروں پہ تھے
تلوار چل رہی تھی مسلسل لڑائی میں
پھٹ پھٹ گئے تھے ڈھالوں کے بادل لڑائی میں
جی چھوٹے گھاٹ چھٹ گیا ہتھیار چھٹ گئے

خوں ناریوں کا اُڑ کے مثالِ شرر گرا
چمکی جو دو طرف یہ اِدھر وہ اُدھر گرا
عرصہ فرس پہ تنگ تھا لاشوں کے ڈھیر سے
یارا نہ جنگ کا تھا نہ طاقت گریز کی
گھاٹ اس طرف تھا باڑھ اِدھر تیغِ تیز کی
آگے لہو کی نہر تھی پیچھے فرات تھی

جو ہم کو روکتی تھیں وہ فوجیں گئیں کدھر
کرتے ہیں مرتضیٰ کے پسر یوں جہم کو سر
یہ مورچے تھے چیونٹیاں تھیں یا فرات پر
اُن کے جواب میں یہ تحیر ہے یہ سکوت
حلقے یہ تھے کمند کے یا تارِ عنکبوت
پانی پہ یہ حباب تھے یا سر پہ خود تھے

نیزے وہ کیا ہوئے جو تلے تھے رم جدل
کیا برچھیوں نے غیرِ مذلت دکھائے پھل
وہ تیر کیا ہوئے وہ کمانیں کدھر گئیں

تر تھے عرق میں ہاتھ میں تھی تیغِ خوں چکاں
ٹھنڈی ہوا کچھار سے آئی جو ناگہاں
بولے یہ کانپ کانپ کے عباسِ نوجواں
واحسرتا کہ دھوپ میں ہیں شاہِ انس و جاں
بس اے صبا جہاں کی فضا ہے قفس ہمیں
پانی کی آرزو نہ ہوا کی ہوس ہمیں

ساحل سے نہر میں جو گیا وہ فلک حشم
دوڑے حباب بحر کہ آنکھوں پہ یہ قدم
پانی میں جلوہ گر تھا جو عکسِ رُخِ عَلم
تھے مہر و ماہ آئینۂ آب میں بہم
آئی صدا درود کی ہر نخل و سنگ سے
دریا زبرجدی تھا پھریرے کے رنگ سے

عباس نامور جو کیے تھے لبوں کو بند
پانی پہ ڈالتا تھا نہ منہ اسپِ سربلند
گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ ارجمند
احسنت اے سمندِ رضا جو وفا پسند
باآبرو خدا ہی سوئے خلد جانے ہیں
تیری وفا کا شور رہے گا زمانے میں

چھینٹیں جو منہ پہ دینے لگا وہ فلک وقار
گردن ہلائی اُس نے کہ یہ بھی ہے ناگوار
پانی گیا جو منہ میں تو میں ہوں گا شرمسار
پیاسا ہے ابنِ فاطمہ کا طفلِ شیرخوار
آقا لہو جگر ہے سکینہ کے حال پر
فاقہ یہ تیسرا ہے محمدؐ کی آل پر

مشکیزہ بھر کے رخش کو آواز دی کہ چل
یاں منتظر تھی راہ کو روکے ہوئے اجل
آئے تھے گھاٹ تک کہ بڑھے برچھیوں کے پھل
تیغوں پہ تیغیں فوج پہ تھی فوج دل پہ دل
گھیرے تھے لوگ امن کی راہیں بھی بند تھیں
نیزے تلے ہوئے تھے کمانیں بلند تھیں

اک شور تھا کہ شیرِ دلاور نہ جانے پائے
سقائے اہلِ بیتِ پیمبر نہ جانے پائے
فرزندِ فاطمہ کا برادر نہ جانے پائے
ہاں نورِ عین ساقیٔ کوثر نہ جانے پائے
پھر ہے ظفر یزید کی گر یہ شہید ہو
عباس کے گلے کو جو کاٹیں تو عید ہو

نعرہ کیا جری نے کہ ہم رکنے والے ہیں؟
دیکھے بھالے سب ہیں جو بھالے سنبھالے ہیں
ابتر کیا تھا جن کو وہی یہ رسالے ہیں
ثابت ہوا کہ دن ابھی ڈھالوں پہ کالے ہیں
بستی کو ڈھونڈھتی ہے بلندی نشانوں کی
شاید ابھی کجی یہ ہے قسمت کمانوں کی

اس وقت سب جہاں مجھے مل کر تو روک لے
فوجیں تو آئیں سامنے لشکر تو روک لے
دیوارِ تیغ و نیزہ و خنجر تو روک لے
تم کیا ہو مجھ کو سدِ سکندر نہ روک لے
آیا ہوں جاں بلب کئی بچوں کو چھوڑ کر
حائل پہاڑ ہو تو نکل جاؤں توڑ کر

فرما کے یہ فرس کو بڑھایا دلیر نے
دریا لہو کا دم میں بہایا دلیر نے
شبیرِ خدا کا زور دکھایا دلیر نے
پٹکا زمین پر جسے پایا دلیر نے
یوں توڑ ڈالیں نیزوں کی ڈانڈیں مروڑ کے
جس طرح پھینک دے کوئی تنکے کو توڑ کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے شریر سب
چوٹیں پڑیں کہ بھول گئے دار و گیر سب
کٹ کٹ گئے ملے ہوئے چلوں سے تیر سب
چھپتے تھے سہم سہم کے برنا و پیر سب
تھیں دھجیاں پھریروں کی ٹکڑے اڑی ہوئی
ڈھالوں میں منہ چھپاتی تھیں تیغیں مڑی ہوئی

جس دوش پر تھی مشک اسی ہاتھ میں علم
سینہ سپر تھی کوندتی تھی تیغِ برق دم
برسا رہے تھے نیزوں کا مینہ بانیِ ستم
رکتے نہ تھے مگر کہیں عباسِ ذی حشم
کیا شیر دل سوار تھا کیا راہوار تھا
جب باگ اٹھائی فوج کی حلقوں کے پار تھا

لشکر یزید کا تھا کہ دریائے بے کنار
پیدل جو گر پڑے تو بڑھے جنگ کو سوار
بھاگے جو وہ تو آئے کنارے پہ نیزہ دار
نیزے قلم کیے تو چلے برچھیوں کے وار
کیونکہ مہم یہ سر ہو اک آفت نصیب سے
پلّے سے تیر چلتے تھے نیزے قریب سے

فوجوں سے اس ترائی میں لڑتے ہوئے جو آئے
مجبور رہا بشر جو مہلت اجل سے پائے
تلواریں سر پہ لگ گئیں پہلو پہ تیر کھائے
غازی کے ہاتھ کٹ گئے شانوں سے ہائے ہائے
پانی بہا تو جان چلی زور گھٹ گیا
دانتوں سے مشک چھوٹ گئی دم الٹ گیا

غش سے فرس پہ جھک کے جو سنبھلا وہ دیں پناہ
مارا کسی نے دیدۂ حق بیں پہ تیر آہ
سر پر لگا جو گرز تو حالت ہوئی تباہ
رہوار سے گرا پسرِ ضیغمِ الٰہ
اٹھ بیٹھتے ہیں لوٹ کے یوں ارضِ پاک پہ
جس طرح زخمی شیر تڑپتا ہو خاک پر

اک شورِ تہنیت کا ہوا فوج میں اُدھر
تلوار ٹیکتے ہوئے دوڑے جو ننگے سر
بے ہاتھ تھامے پاؤں بڑھانا محال تھا

بھائی کا داغ دردِ جگر تین دن کی پیاس
فرماتے تھے پسر سے ٹھہر کر بدرد و یاس
بتلاؤ اب کہ حال ہمارا تباہ ہے

دم چڑھ گیا ہے سانس اکھڑتی ہے دم بدم
دنیا سے کھو گئے ہیں عباسِ ذی حشم
سب گھٹ گیا ہے خوں جو مرا رنگ زرد ہے

دم توڑتا ہے نہر پہ شاید وہ مہ لقا
کس وقت میں بچھڑ گیا ہم سے وہ باوفا
ڈھونڈے گی اُن کو روح اگر مر بھی جاؤں گا

پہونچے ترائی میں جو شہِ دیں بصد تعب
بازو کٹے تھے خون میں ڈوبا تھا جسم سب
آنکھوں سے نزع میں بھی رواں جوئے اشک تھی

سینے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
اے مرے شیر اے مرے جرّارِ صف شکن
مرتے ہیں ہم جلا دو ہمیں منہ سے بول کے

غازی نے آنکھیں کھول کے دیکھا رُخِ امام
کروٹ جو لی کراہ کے کانپا بدن تمام
مانندِ بوئے گل دمِ آخر گزر گیا

یاں بارِ غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
تھاما پسر نے بازوئے شبیرِ نوحہ گر
جس طرح بے قرار ہو بسمل یہ حال تھا

ضعفِ بصر شکستہ کمر منتشر حواس
اکبر کدھر ہے لاشۂ عباسِ حق شناس
رستہ پہاڑ ہو گیا کیا سخت راہ ہے

صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اُٹھیں قدم
سیدھا ہوں کس طرح یہ برادر کا ہے الم
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے

یہ تھی کراہنے کی اُسی شیر کی صدا
دو بھائیوں کو موت بھی آئی نہ ایک جا
پیدا نہ باپ ہو گا نہ بھائی کو پاؤں گا

سقائے اہلِ بیت نظر آئے جاں بلب
دم توڑتے تھے ہچکیاں لے لیکے ہے غضب
پرخوں علم پہ ہاتھ تھا چھاتی پہ مشک تھی

حاضر ہوا برادرِ مظلوم و بے وطن
آزردہ ہو کے دیر میں پہونچا یہ خستہ تن
دیکھو تو حال بھائی کا آنکھوں کو کھول کے

اینٹھی تھی یہ زباں کہ نہ کچھ ہو سکے کلام
آتا تھا ہچکیوں کا کہ تھا موت کا پیام
منزل پہ بوجھ رکھ کے مسافر گزر گیا

بھائی جواں جو مرگیا بھائی کے سامنے
حضرت سے عرض کی پسرِ تشنہ کام نے
ماتم بپا نہ ہو جسدِ پاش پاش پر
فرمایا شاہ نے کہ برادر کو رو تو لوں
سقائے اہلِ بیتِ پیمبر کو رو تو لوں

صبر آئے کس طرح ابھی تازہ جدائی ہے
مرجائے بھائی اور نہ بھائی بکا کرے
چھاتی پھٹے اگر نہ گریباں قبا کرے
مرتے ہی اس کے رشتۂ الفت کو توڑ دوں

ناگاہ در سے خیمہ کے فضہ نے دی صدا
کیسا یہ غل ہے نہر پہ اے شاہِ کربلا
تن کانپتا ہے ضعف سے ہاتھوں میں ہاتھ ہے

یہ شور سن کے لاش سے اٹھے امامِ دیں
چلائی رو کے عاشقِ عباس مہ جبیں
چھائی ہوئی ہے کیسی اداسی نشان پہ

لائے علم جو خیمے میں سلطانِ بحر و بر
دیکھا جو اس علم کا پھریرا لہو میں تر
سر پیٹتی تھی کوئی کوئی خاک اڑاتی تھی

چلاتے تھے حسین کہ غم خوار مر گیا
قوت تھی جس سے ہائے وہ جرار مر گیا
اب کون آفتوں میں رکھے گا خبر مری

پٹکا زمیں پہ سر سے عمامہ امام نے
چلیئے اب اہلِ بیتِ محمد کو تھامنے
نکلی سکینہ گر تو سب آئیں گی لاش پر
مظلوم کو شہید کو صفدر کو رو تو لوں
عاشق کو بے وطن کو دلاور کو رو تو لوں

اولاد باپ کی ہے برابر کا بھائی ہے
غربت میں ہو یہ جس پہ مصیبت وہ کیا کرے
میری بھی موت اب کہیں جلدی خدا کرے
گودی میں جو پلے اُسے جنگل میں چھوڑ دوں

دریا سے کس طرف گئے عباسِ باوفا
گھر سے نکل پڑی ہے سکینہ برہنہ پا
عباس کا پسر بھی سکینہ کے ساتھ ہے

مشک و علم کو لیکے چلے اکبرِ حزیں
ہے ہے علم تو آتا ہے میرے چچا نہیں
کیا بن گئی ارے مرے عمو کی جان پر

رایت کے ساتھ ساتھ تھے بچے برہنہ سر
سیدانیاں زمیں پہ گریں تھام کر جگر
ہے ہے کا شور تھا کہ زمیں تھرتھراتی تھی

زینب ہمارا بابرِ وفادار مر گیا
سقائے آلِ احمدِ مختار مر گیا
سیدھی نہ ہو گی قبر میں بھی اب کمر مری

غش جس جگہ تھی زوجۂ عباسِ نوجواں
سب مل کے اس کو زیرِ علم لائیں بی بیاں
بکھرا کے سر کے بال پکاری وہ خستہ جاں
لوگو بتاؤ لاشِ علمدار ہے کہاں
پوچھو بلائیں لیکے شہِ تشنہ کام کی
کیا وجہ ہے کہ لاش نہ لائے غلام کی

بولی یہ رو کے بانوئے بیکس بدرد و غم
وہ کہہ گئے تھے آپ وصیت یہ مرتے دم
چلائی سر کو پیٹ کے وہ کشتۂ الم
صاحب ترستے رہ گئے دیدار کو بھی ہم
مرتے ہوئے نہ چاند سی صورت دکھا گئے
کس بات پر کنیز سے صاحب خفا گئے

خاموش اب انیس کہ اک حشر ہے بپا
مجلس میں چار سمت ہے اک شورِ مرحبا
کر حق سے ہاتھ اٹھا کے بصد عجز یہ دعا
یارب دکھا دے روضۂ سلطانِ کربلا
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

رعبِ شہِ ذی جاہ سے تھراتے ہیں
سب طرزِ غلامانہ بجا لاتے ہیں
آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں
آتے ہیں تو جھک جھک کے علم آتے ہیں

رباعی

شاہانِ جہاں سب ہیں گدائے حیدر
ہے ابرِ کرم دستِ سخائے حیدر
یعقوب و خلیل و یوسف و آدم و نوح
سب کی مشکل میں کام آئے حیدر